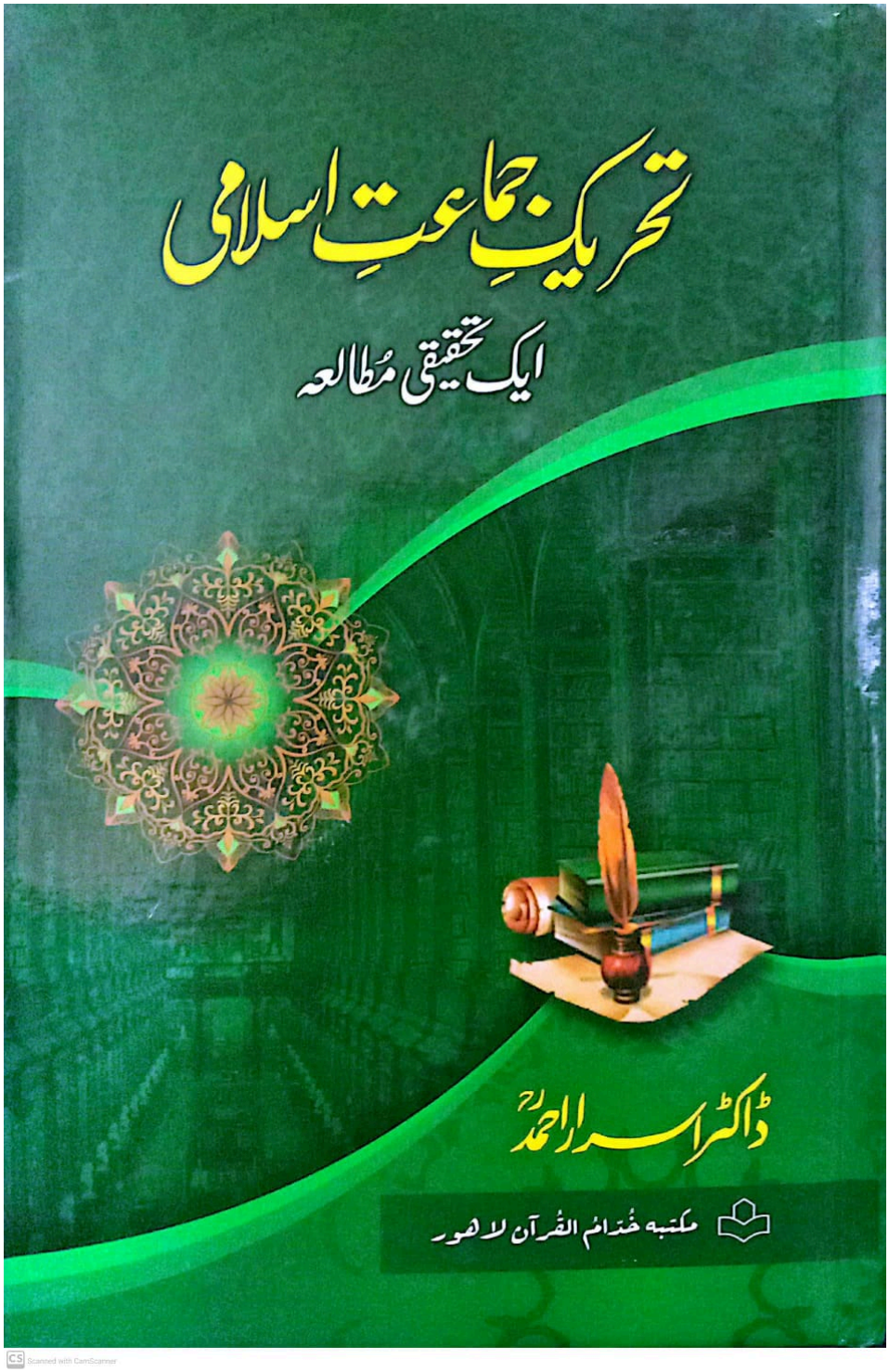


Scanned with CamScanner

تحریکِ جماعتِ اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

دیباچہ طبع دوم

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۶۶ء میں میرے ذاتی اشاعتی ادارے ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' کے تحت شائع ہوا تھا۔ کئی سال سے یہ بالکل نایاب تھی۔ لگ ‘بھگ سترہ سال بعد اس کا یہ دوسرا ایڈیشن ''مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی'' کے زیر اہتمام پیش خدمت ہے۔

ان سترہ سالوں کے دوران یقیناً بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا ہے اور حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض شخصیتیں اور جماعتیں تو ماضی کے دھندلکوں میں بالکل ہی گم ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں ان میں سے بھی بہتوں کا معاملہ یہ ہے کہ ع ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!''

تاہم اس کتاب کا موضوع تا حال زندہ ہے۔ اس لیے کہ یہ برصغیر پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی جس اہم دینی تحریک کے ''تحقیقی مطالعہ'' پر مشتمل ہے اس کے کم از کم قدیم نام کے تسلسل کے ساتھ ایک نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعت پاکستان میں اور ایک نیم مذہبی اور نیم سماجی جماعت ہندوستان میں موجود ہے‘ اور یہ سوال دین اور تاریخ دونوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے اہمیت کا حامل ہے کہ تقریباً نصف صدی پیشتر شروع ہونے والی اس اسلامی تحریک کے ساتھ ‘جس کا ابتدائی انداز بڑا ''انقلابی'' تھا‘ کیا حادثہ پیش آیا کہ بظاہر ایک مضبوط تنظیم اور لاتعداد مخلص کارکنوں کی مخلصانہ مساعی کے باوجود وہ روز بروز منزل سے دور سے دور تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ محض ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر لے؟ آیا اس کا آغاز ہی غلط تھا اور صورت وہ تھی کہ ع ''مری تعمیر میں مضمر تھی اِک صورت خرابی کی!''

یا یہ بعد میں کوئی غلط موڑ مڑ گئی؟ اگر پہلی بات ہے تو تشخیص ہونی چاہیے کہ ابتدائی نظریات و تصورات میں کیا کجی یا خامی تھی‘ اور اگر دوسری بات ہے تو تعیین ہونی چاہیے کہ وہ غلط موڑ کس مرحلے پر مڑا گیا!

کسی دوسرے شخص کے لیے یہ معاملہ محض علمی دلچسپی کا بھی ہو سکتا ہے، لیکن میرے لیے اس کی اہمیت واقعی اور عملی ہے، اس لیے کہ میں نے نہ کبھی پہلے اس اعتراف میں کوئی جھجک محسوس کی، نہ آج کوئی عار محسوس کرتا ہوں کہ میرے قلب و ذہن پر اس تحریک نے نہایت گہرے اور لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ چنانچہ میں نے نہ صرف یہ کہ اپنی جوانی کے دس سال اس تحریک کے ساتھ بھرپور وابستگی کی نذر کیے تھے، بقول شاعر ؎

یہ اور بات کہ تم پر نثار کر دی ہے
عزیز اپنی جوانی کسے نہیں ہوتی ! !

بلکہ اس تنظیمی تعلق کے انقطاع پر رُبع صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود تا حال صورت یہ ہے کہ ؎

تخم جس کا تُو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی !

چنانچہ اس وقت راقم جو کچھ کر رہا ہے اور جس دعوت کو لے کر کھڑا ہوا ہے اس کے ذہنی و فکری پس منظر کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے رفقاء و احباب، ناقدین و مبصرین اور مخالفین و معاندین سب کے لیے اس تحریک کے بارے میں اس کی رائے کو جاننا اور سمجھنا لازمی و لابدی ہے۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے پیش کردہ تصوّرِ دین و مطالباتِ دین پر ایک نہایت اہم اور اساسی اور نہایت مدلل اور زور دار تنقید جماعت اسلامی ہند سے علیحدہ ہونے والی ایک معروف شخصیت جناب وحید الدین خاں (حال مدیر ''الرسالہ'' دہلی) کی تالیف ''تعبیر کی غلطی'' کی صورت میں پیش نظر کتاب کے طبع اول کے تقریباً ساتھ ہی منصۂ شہود پر آئی تھی،

اور ایک نسبتاً نرم تنقید تقریباً تین سال قبل مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہٗ کی تالیف ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح'' کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ ان سطور کے راقم نے بھی اس موضوع پر اپنے ایک کتابچے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں ''تعبیر کی کوتاہی'' کے عنوان سے اظہارِ رائے کیا ہے۔

لیکن پیش نظر کتاب کے بارے میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ اس کا اصل موضوع یہ نہیں ہے' بلکہ اس میں ''تحریک جماعت اسلامی'' کا امکانی حد تک معروضی مطالعہ اس نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے کہ ۴۱ - ۱۹۴۰ء میں اس تحریک کے آغاز کے وقت اس کے اصول و مبادی کیا تھے اور پھر ۱۹۴۷ء میں اس کا جزو اعظم یعنی جماعت اسلامی پاکستان کیا غلط موڑ مڑ گئی جس کے باعث وہ پاکستانی سیاست کی بھول بھلیوں میں اس طرح گم ہو کر رہ گئی کہ اس کے قدیم متوسلین کی عظیم اکثریت حیران و پریشان ہے کہ ؎

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں؟

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو تحریک جماعت اسلامی کے دورِ اوّل کے بارے میں جو رائے اس کتاب میں ظاہر ہوئی ہے اور بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکوں کے تصورِ دین کے ضمن میں جو رائے ''تعبیر کی کوتاہی'' کے عنوان سے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ'' میں سامنے آئی ہے' ان میں کچھ فرق و تفاوت بلکہ تضاد نظر آئے ----- اس لیے یہ وضاحت بے محل نہ ہو گی کہ دین کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور خارجی جبکہ دوسرا داخلی و باطنی ----- مقدّم الذکر کی جامع تعبیر ''اسلام'' ہے اور مؤخر الذکر کا جامع عنوان ''ایمان''۔ اسلام کا آغاز ''اقرارٌ باللسان'' یعنی کلمۂ شہادت سے ہوتا ہے اور اس کی اساس پر اوّلاً عبادات و معاملات کے ایک مکمل نظام کی وسیع و عریض عمارت وجود میں آتی ہے اور پھر شہادت علی الناس اور اقامت و اظہارِ دین حق کی بالائی منزلیں تعمیر ہوتی ہیں' جن کے لیے دعوت و حرکت اور سعی و جُہد کا جامع عنوان ہے ''جہاد فی سبیل اللہ''۔

دوسری طرف ایمان کا نقطۂ آغاز ''تَصْدِیقٌ بِالقَلب'' ہے اور اس کی جڑیں انسان کے باطن کی گہرائیوں میں اترتی ہیں تو تدریجاً علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور نتیجتاً صبر و توکّل' تسلیم و رضا' تضرع و اِخبات' تفویض الامر الی اللہ اور محبّتِ الٰہی کے سوز و گداز کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف میں جہاں تک دین کے مقدّم الذکر پہلو کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے وہ میری رائے میں نہایت جامع بھی ہے اور بحیثیت مجموعی صحیح اور درست بھی' اور اسی کا مظہر ہے تحریک جماعت اسلامی کا دورِ اوّل اور اس کے

اصول و مبادی' البتہ جہاں تک مؤخر الذکر پہلو کا تعلق ہے اس کے ضمن میں افسوسناک حد تک کمی اور کوتاہی پائی جاتی ہے' جس کے باعث یہ تحریک مجموعی مزاج اور عمومی نتائج کے اعتبار سے ''دینی'' سے زیادہ ''دنیوی'' بن کر رہ گئی ----- اور راقم کے نزدیک اب دعوتِ دین اور حرکت اسلامی کے میدان میں ''کرنے کا اصل کام'' یہ ہے کہ دین کے خارجی تصوّرات اور تقاضوں کی جامعیت اور ہمہ گیریت کو برقرار رکھتے ہوئے اس داخلی و باطنی عنصر کی کمی کی تلافی کی کوشش کی جائے' نہ یہ کہ توجہات کو باطنی پہلوئوں پر اس طور سے مرتکز کر دیا جائے کہ دین اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں کا تصور محدود ہو کر دنیا کے مروّجہ مذہبی تصورات کی شکل اختیار کر لے ! ! اور اس طرح افراط کی جگہ تفریط کی صورت پیدا ہو جائے۔ اَعَاذنا اللّٰہُ مِن ذٰلک ! !

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بغیر کسی تبدیلی کے بالکل جوں کا توں پیش کیا جا رہا ہے۔ صرف ایک مقام پر ایک لفظی تبدیلی کی گئی ہے اور وہ ہے صفحہ نمبر۱۹۵ کی سطر نمبر ۹ میں ' جہاں قوسین میں پہلے ایڈیشن کے ''حُبّ ِعاجلہ'' کو ''عجلت پسندی'' سے بدل دیا گیا ہے۔ یہ ایک تسامح تھا جس کی جانب ماہنامہ ''زندگی'' (رام پور بھارت) کے مدیر جناب عروج قادری نے توجہ دلائی تھی 'جس کے لیے راقم ان کا ممنون ہے۔

10

اس کتاب کا دیباچہ طبع اوّل (ص۱۲ تا ۲۸)آج سے سترہ سال قبل کا تحریر شدہ ہے اور بقیہ پوری کتاب اس بیان پر مشتمل ہے جو اس سے بھی دس سال قبل ۱۹۵۶ء میں ضبط ِتحریر میں آیا تھا جب کہ میری عمر کل چوبیس برس تھی --- زبان و ادب کے میدان کا شہسوار ہونے کا تو راقم اب بھی مدّعی نہیں ہے تاہم اُس وقت تو بالکل گھٹنوں چلنے والی بات تھی۔ چنانچہ لغت اور انشادونوں کی بے شمار غلطیاں اس میں موجود ہیں۔ بایں ہمہ چونکہ اب اس تحریر کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے لہٰذا اس میں کوئی اصلاح نہیں کی گئی۔

آخر میں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب کے صفحات ۱۷۰ تا ۱۷۶ میں ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ضمن میں جو بحث آئی ہے' اس میں ایک تو اصلاً قادیانی مسئلے میں جماعت اسلامی پاکستان کا اُس وقت کا طرز عمل زیر بحث آیا ہے' نہ کہ اصل مسئلہ قادیانیت اور دوسرے اس سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید راقم کے نزدیک لاہوری احمدی' دائرۂ ملت اسلامی سے خارج نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کو اگر پہلے کچھ تردّد تھا بھی تو ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور اس کے دوران سامنے آنے والے حقائق کے بعد وہ بالکل رفع ہو چکا ہے۔

میرے نزدیک اس امر میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آنجہانی غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے بعد ایسے کسی بھی شخص کو نبی یا مجدد ماننے والا تو درکنار، محض مسلمان ماننے والا شخص بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

تحریر ۳۱ جنوری ۱۹۸۳ء

دیباچہ طبع اوّل

پیش نظر تحریر در اصل ایک بیان ہے جو بحیثیت رکن جماعت اسلامی راقم الحروف نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان کے اس کُل پاکستان اجتماع کے موقع پر جو کراچی میں نومبر ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوا تھا، ایک اجلاس مرکزی مجلس شوریٰ کا منعقد ہوا جس کے سامنے وہ بہت سے اعتراضات اور متبادل تجاویز و مشورے پیش کیے گئے جو جماعت کی پالیسی اور نظام سے متعلق جماعت کے اراکین کی جانب سے موصول ہوئے تھے اور جن پر معترضین اور مجوزین حضرات اجتماعِ ارکان میں بحث کرنا چاہتے تھے۔ مرکزی مجلس شوریٰ نے اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر طریق کار اور دستور سے متعلق ان دقیق بحثوں کو ارکان کے اجتماع میں چھیڑنے کی اجازت دے دی گئی تو ہنگامہ برپا ہو جائے گا، یہ فیصلہ کیا کہ ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے کہ جن میں نظم جماعت اور اس کے دستور میں بحث کی گئی تھی ایک مجلس تدوین دستور کا انتخاب عمل میں لایا جائے جس میں جماعت کے تمام تنظیمی حلقوں کو تعدادِ ارکان کے تناسب سے نمائندگی دی جائے (۱) تاکہ یہ مجلس جماعت کے لیے ایک نیا دستور مدوّن کرے اور ان اعتراضات اور تجاویز پر غور کرنے کے لیے جو جماعت کے طریق کار اور پالیسی سے متعلق ہیں ایک جائزہ کمیٹی کی تشکیل کی جائے جس کے سپرد یہ خدمت ہو کہ وہ تمام پاکستان کا دورہ کر کے جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ لے، اور ارکانِ جماعت سے فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے ان کی بے چینی کے اسباب معلوم کرے اور جو تجاویز ان کے ذہنوں میں ہوں ان کو مرتّب کر کے ایک جامع رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرے۔

_____(۱) اس مجلس میں حلقہ اوکاڑہ کے دو نمائندوں میں ایک راقم الحروف بھی منتخب ہوا تھا۔

یہ مجلس ابتداءً آٹھ ارکان پر مشتمل تھی، لیکن چند ماہ بعد بعض وجوہات کی بنا پر اس کو مختصر کر دیا گیا اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کی سرکردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبد الجبار غازی صاحب، مولانا عبد الغفار حسن صاحب اور جناب شیخ سلطان احمد صاحب (۲) پر مشتمل اس ''جائزہ کمیٹی'' نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصے میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائض مفوضہ(۳) کو ادا کیا اور نومبر ۱۹۵۶ء میں ایک رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔
یہی وہ جائزہ کمیٹی تھی جس کی خدمت میں پیش نظر بیان پیش کیا گیا۔

آج سے تقریباً دس سال قبل کی ایک تحریر کو اشاعت عام کے لیے پیش کرتے ہوئے اس سوال کا جواب فطری طور پر میرے ذمے ہے کہ آج تک میں نے اس کو کیوں شائع نہ کیا اور اب کیوں کر رہا ہوں!

اب سے پہلے اس تحریر کو شائع نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ یہ تحریر برصغیر پاک و ہند کی ایک معروف دینی و سیاسی جماعت کے بارے میں ایک تاریخی مطالعہ ہونے کے اعتبار سے عمومی دلچسپی کی حامل بھی ہے لیکن اس کے اصل مخاطب جماعت اسلامی کے متعلقین ہی ہیں۔ اور جماعت کے حلقے میں متذکرہ بالا جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے

_____(۲) یہ خیال رہے کہ یہی وہ تین حضرات ہیں جن پر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی غیر موجودگی میں وقتاً فوقتاً جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کی ذمہ داری ڈالی گئی۔(۳) مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۵، تا ۱۸، مارچ ۱۹۵۶ء نے جائزہ کمیٹی کے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی تھی:(۱) جماعت کی پالیسی، نظم اور حالات کے متعلق جو اعتراضات، شکایات اور تجاویز سالانہ اجتماع کے موقع پر موصول ہوئی تھیں، ان کے بھیجنے والوں سے گفتگو کر کے یہ تحقیق کریں کہ ان شکایات کی بنیاد کیا ہے اور وہ اصلاح کے لیے

ایجابی صورت میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔ (ب) جماعت کے ارکان میں اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی پالیسی، طریق کار اور حالات کے بارے میں کچھ تبدیلی چاہتے ہیں، تو ان سے تحقیق کریں کہ وہ کیا تبدیلی چاہتے ہیں۔

کے فوراً بعد جو ہنگامی صورتِ حال (۴) پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں نہ صرف پوری جائزہ کمیٹی بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی اور کم و بیش پچاس ساٹھ ارکان جماعت، جماعت سے علیحدہ ہوئے اور پھر الزامات اور ان کے جوابات کا جو تلخ سلسلہ شروع ہوا اس نے جماعت کی اندرونی اور اس کے قریب کی فضا کو اس درجہ مکدر کر دیا تھا کہ اس میں اس بات کا سرے سے کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی بھی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے۔ یہ سلسلہ پورے شد و مد کے ساتھ مسلسل کئی سال جاری رہا اور اس کے نتیجے میں جماعت سے متعلق اور اس سے دلی ہمدردی رکھنے والے حضرات کے ذہنوں میں جماعتی

---

(۴) اس ''ہنگامی صورتِ حال'' کی مختصر تشریح کے لیے میں اپنی رکنیت جماعت سے استعفاء کے حسب ذیل الفاظ نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں: ''جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہوا، شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا، بہت رد و قدح کے بعد اور بالآخر خوف انتشار کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک لایعنی اور مہمل قرارداد کا پاس ہونا، پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف رد عمل، اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں، اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار، سعید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفاء اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت کی طرف سے تعاقب، امیر جماعت کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجویٰ، گروہ بندی اور ''غیر شعوری'' سازش کا الزام، مولانا امین احسن صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت، امیر جماعت کا جذباتی انداز میں استعفاء از امارت جماعت، جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قراردادہائے اعتماد، دو اراکین مرکزی شوریٰ کی رکنیت جماعت کا تعطل، مولانا عبد الجبار غازی صاحب کا استعفاء از رکنیت جماعت، مولانا عبد الغفار حسن صاحب کا استعفاء از مناصب جماعت، سلطان احمد صاحب کا استعفاء از رکنیت شوریٰ ... یہ سارے معاملات میرے لیے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی

جماعت بن گئی ہے اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں‘ لیکن اس لحاظ سے کہ توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی نزل اور گراوٹ کے بارے میں اتنی پست رائے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی...‘‘

14

عصبیت اس درجہ راسخ ہو گئی کہ ان کے قلوب و اذہان نے جماعت سے نکلے ہوئے تو کجا جماعت سے باہر کے کسی بھی شخص کی بات سن کر اس پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس معاملے میں سارا الزام میں جماعت کے متعلقین ہی کو نہیں دیتا‘ واقعہ یہ ہے کہ ان کی ایک غالب اکثریت کے سامنے نہ صرف یہ کہ اختلاف کی صحیح نوعیت اپنی اصل صورت میں کبھی نہیں آئی بلکہ اہلِ اختلاف نے اظہارِ اختلاف کا جو طریقہ اختیار کیا اس کی بھی جو صورت ان کے سامنے آئی وہ بظاہر بہت بھونڈی اور نا قابلِ فہم تھی۔ نتیجتاً جماعتی عصبیت کی وہ کچی دیوار جو فطری طور پر پہلے بھی دلو میں موجود تھی تعصب کی ایک پختہ فصیل میں تبدیل ہو گئی۔

ان حالات میں اس تحریر کی اشاعت سے کسی مثبت اور تعمیری فائدے کے حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور اس کے شائع کرنے سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوتا کہ اس کے مصنف کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا اور اس کی بھڑاس نکل جاتی‘ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے اس بندۂ ضعیف پر جس کا شکر وہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا کہ محض یہ منفی محرک اسے اس کی اشاعت پر آمادہ نہ کر سکا۔ اس دس سال کے عرصے میں راقم الحروف نے اپنی اس تحریر کو متعدد بار از اول تا آخر پڑھا جس سے اس کی صحت پر اس کا یقین مزید پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کئی بار دل میں اس کی اشاعت کا خیال بھی پیدا ہوا لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس سے کوئی تعمیری اور مثبت فائدہ نظر نہ آیا‘ اس کی اشاعت کو ملتوی کیا جاتا رہا۔

ادھر دو تین سال سے فضا قدرے پُر سکون ہوئی ہے اور غیظ و غضب کی وہ آگ ذرا ٹھنڈی ہوئی ہے جو تلخ الزامات اور ان کے تلخ تر جوابات سے دلوں میں بھڑکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ’’نکلنے والے‘‘ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں اور ’’رہنے والے‘‘ اپنے مسائل میں مشغول‘ اور اگرچہ اب بھی طنز و تعریض کے اِکّا دُکّا تیر چلتے رہتے ہیں اور خاص طور پر جب کوئی رکن جماعت اور خصوصاً اس کا کوئی اہم رکن کسی سبب سے جماعت اسلامی کو خیرباد کہتا ہے تو نکلنے والوں کے حلقے میں خواہی نخواہی ویسی ہی خوشی

15

لی لہر دوڑ جاتی ہے جیسی کرکٹ کے کسی میچ میں مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کے آئوٹ ہونے سے ہوتی ہے اور اس کے ردِّ عمل کے طور پر اہلِ جماعت بھی ’’خوارج‘‘ کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ تاہم یہ سب کچھ اب ’’الشاذ

کالمَعدوم'' کے حکم میں ہے' ورنہ عام طور پر فضا میں وہ تکدر باقی نہیں رہا جو لبھی تھا اور نتیجتاً اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ جماعت سے متعلق حضرات میری اس تحریر کو کسی قدر کھلے دل سے پڑھ سکیں گے۔ اسی امید پر میں اب اس تحریر کو اشاعت عام کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

اس تحریر کا اولین حصّہ جسے اب میں نے ''مقدّمہ'' کا عنوان دیا ہے' کچھ اس بیان کی ''شانِ نزول'' سے متعلق ہے اور کچھ اس کے مصنف کے ذاتی حالات و کوائف پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا جزو تو ویسے ہی اس تحریر کے اصل پس منظر کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔ البتہ دوسرے حصے کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل مضمون سے غیر متعلق ہے اور یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے اصل مقصود ''نمائش ذات'' ہے۔ لیکن میرے نزدیک چونکہ ''کچھ اپنے بارے میں'' کے لکھنے سے جو غرض اس کی تحریر کے وقت پیش نظر تھی وہ آج بھی جوں کی توں موجود ہے' لہٰذا ان تمام امکانات کے باوجود اور اس کے علی الرغم کہ میں خود اس میں ایک فطری سا حجاب محسوس کرتا ہوں' اس کو شاملِ اشاعت کر رہا ہوں۔ اس حصے کی تحریر سے جو غرض یا اغراض میرے پیش نظر تھیں' ان کی وضاحت میں نے تفصیل سے اصل تحریر میں کر دی ہے۔ (۵)

''تحریک جماعت اسلامی کا دورِ اول اور اس کے بنیادی افکار و نظریات'' اور ''دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات'' اس تحریر کا اصل موضوع ہیں۔ اس ضمن میں یہ تصریح ضروری ہے کہ ''تحریک جماعت اسلامی'' اور ''مولانا مودودی کی تحریک اسلامی'' دو مختلف موضوعات ہیں۔ مؤخر الذکر موضوع پر پروفیسر محمد سرور صاحب کی ایک تصنیف اس سے

---

(۵) بر صفحہ ۴۳

پہلے موجود ہے‘ اور خواہ اس سے کلی یا جزوی اتفاق یا اختلاف کیا جائے‘ بہرحال اس کتاب میں اپنے عنوان سے مناسبت رکھنے والا مواد ایک خاص نقطۂ نظر سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس میری اس تحریر کا موضوع ’’تحریک جماعت اسلامی‘‘ ہے اور اسی کے دو ادوار سے اس میں بحث کی گئی ہے۔

اس معاملے میں خلط مبحث خود مولانا مودودی صاحب کا پیدا کردہ ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ’’جماعت اسلامی‘ اس کا مقصد‘ تاریخ اور لائحۂ عمل‘‘ کی ابتدا ان الفاظ سے فرمائی ہے:

’’جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے وہ پچھلے اٹھارہ سالوں میں دو مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب تیسرا مرحلہ شروع ہے۔ پہلا مرحلہ خالص تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کا تھا جس کا سلسلہ تقریباً نو سال جاری رہا۔ دوسرا مرحلہ تنظیم و تربیت کا تھا اور اس میں تقریباً چھ سال صرف ہوئے۔ اب تیسرا مرحلہ توسیع و عملی اقدام کا ہے جسے شروع ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔‘‘

یہ تحریر اکتوبر ۱۹۵۴ء کی ہے۔ اس حساب سے مولانا مودودی صاحب کے نزدیک ’’جماعت اسلامی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے‘‘ اس کی ابتدا ۳۴- ۱۹۳۳ء سے ہوتی ہے‘ یعنی جب کہ مولانا نے ماہنامہ ’’ترجمان القرآن‘‘ جاری فرمایا تھا۔

اس کے پانچ سال بعد جب ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا مودودی صاحب نے ایک مرتبہ پھر جماعت اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان فرمائی تو متذکرہ بالا مرحلۂ اوّل کو مزید تین ادوار میں تقسیم کیا اور اس کے دورِ اول کی ابتداء ۱۹۲۸ء سے کی‘ یعنی جب سے مولانا موصوف نے ’’لکھنا‘‘ شروع کیا۔

میرے نزدیک یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ مولانا مودودی صاحب کو یقیناً اس کا حق ہے کہ اپنے ذہنی ارتقاء کے مختلف منازل اور اس سفر کے دوران لیے گئے موڑوں (turns) کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے ابتدا جہاں سے چاہیں کریں۔ لیکن جماعت اسلامی کی تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کی ابتدا اس طرز پر کرنا صرف اس صورت میں درست ہو سکتا تھا کہ ’’جماعت اسلامی‘‘ کچھ لوگوں کے مولانا مودودی

صاحب کے ہاتھ پر ’’بیعت‘‘ کرنے سے معرض وجود میں آئی ہوتی۔ اس صورت میں کسی دستور کا مرتّب ہونا اور امیر جماعت کا منتخب کیا جانا بے معنی ہوتا۔

میرے نزدیک جماعت اسلامی کے قیام سے قبل مولانا مودودی صاحب نے جو کام کیا‘ وہ دو طرح کا ہے۔

ایک خالص علمی و تحقیقی کام جس کے نتیجے میں مولانا کے ذہن میں دین کا ایک خاص تصور اور اس کے تقاضوں اور مطالبات کا ایک خاص نقشہ تیار ہوا‘ جس کو مولانا نے اپنی تصانیف اور تالیفات میں مفصل و مدلل پیش

لیا۔ اپنے کام کے اس میدان میں مولانا مودودی صاحب کی حیثیت ایک متکلم اسلام کی ہے اور قطع نظر اس سے کہ ان کے پیدا کردہ ''جدید علم کلام'' میں خطا و صواب کا تناسب کیا ہے' بہر حال متکلمین اسلام کی صفوں میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

دوسرا مسلمانانِ ہند کے قومی و سیاسی مسائل میں مولانا کی آراء اور ان کے حل کے لیے مولانا کے مشورے و تجاویز' اس میدان میں حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ مولانا کے نظریات بھی تبدیل ہوتے رہے اور ان کی تحریروں میں مختلف رنگ نمایاں ہوتے رہے۔ ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے حصص اول و دوم میں وہ مسلم قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں 'لیکن اسی کتاب کے حصّہ سوم میں جو ۳۹-۱۹۳۸ء میں لکھی گئی وہ مسلم قوم پرستی کو کفر کی حد تک پہنچا کر ایک خالص اصولی اسلامی دعوت کے علمبردار بن کر سامنے آتے ہیں۔

اپنے موقف کے ان انقلابات کی توجیہہ بیان کرنے کا مولانا مودودی صاحب کو پورا حق ہے۔ اسی طرح ان کے ناقدین کو بھی حق ہے کہ وہ ان کی بیان کردہ توجیہات کو عقل اور دلیل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ لیکن یہ بہر حال ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام ان نظریات کی اساس پر نہیں ہوا جو مولانا نے سیاسی کشمکش کے پہلے اور دوسرے حصوں میں بیان فرمائے ہیں بلکہ ان پر ہوا ہے کہ جو اس کے تیسرے حصے میں مفصل و مدلل بیان ہوئے ----- ! ان نظریات کو اساس بنا کر مولانا نے ۱۹۴۰ء میں

ایک اسلامی جماعت کی تشکیل کی دعوت دی' جس کو قبول کرنے والوں میں وہ بھی تھے کہ جو مولانا مودودی کے پہلے سیاسی موقف سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور اس پر شدید تنقیدیں کر چکے تھے۔

لہٰذا ''تحریک جماعت اسلامی'' کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ۳۹-۱۹۳۸ء سے شمار کی جا سکتی ہے۔ اس تحریک کے داعی یقیناً مولانا مودودی ہی ہیں' لیکن ان کی جس دعوت پر جماعت اسلامی قائم ہوئی وہ سیاسی کشمکش حصص اوّل و دوم کی نہیں بلکہ صرف حصّہ سوم کی ہے۔ رہے ان کے مخصوص ''کلامی نظریات'' اور ان کا خاص تصوّرِ دین و تحریک اسلامی تو جہاں یہ واقعہ ہے کہ وہ اولاً بھی جماعت کی اساس میں موجود تھے اور بعد میں بھی پیہم اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے رہے وہاں یہ بھی ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ کچھ اور اہلِ قلم کی تحریروں نے بھی جماعت اسلامی کے تصوّرِ دین اور تحریک اسلامی کے خطوط اور نقوش مرتّب کرنے میں اہم حصّہ ادا کیا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف تو اس معاملہ میں انتہائی مؤثر ثابت ہوئیں۔ حتیٰ کہ یہ حقیقت ہے کہ جماعت کی تشکیل کے بعد اس کے تحریکی لٹریچر میں مولانا اصلاحی صاحب کی تحریروں کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے۔

خود تشکیل جماعت جس طرز پر ہوئی وہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ''تحریک جماعت اسلامی'' ایک

جداگانہ وحدت(entity)ہے' چاہے اس کا جزوِ اعظم مولانا مودودی صاحب کی شخصیت ہی قرار پائے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے یہ جماعت اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ کچھ لوگوں نے مولانا مودودی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہو' بلکہ اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ کچھ لوگوںنے ایک نصب العین کے بعد' اس کی ایک مخصوص تشریح اور ایک مکمل دستور کے ساتھ وفاداری کا رشتہ استوار کیا۔ اور پھر انہوں نے اپنے میں سے ایک امیر اور اس کی ایک مجلسِ شوریٰ منتخب کی اور ان کے مابین اختیارات کی حدود کو متعین کر دیا۔

''تحریک جماعت اسلامی کا دورِ اوّل'' یعنی اس کتاب کا باب دوم اس کا وہ اصل

حصّہ ہے جس کی اشاعت کے لیے اس پوری کتاب کو شائع کیا جا رہا ہے۔

اس تحریک کے بنیادی نظریات اور اس کے اساسی تصوّرات کا جو مرقع میں نےپیش کیا ہے' میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے جزوی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس تحریک کے افکار و نظریات کی صحیح عکاسی نہیں ہے ! جماعت اسلامی کی یہ شبیہہ میرے ذہن و وجدان کے داخلی پردوں پر تو منقش ہے ہی اس کی صحت پر خارجی شواہد بھی مجھے اتنے ملے ہیں کہ اس پر میرا یقین انتہائی پختہ ہوتا چلا گیا۔ جماعت اسلامی سے عملی یا ذہنی دلچسپی رکھنے والے جس شخص نے اسے پڑھا اس نے اس امر کی گواہی دی کہ واقعتا جماعت اسلامی کی صحیح تصویر یہی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جو نومبر' دسمبر ۱۹۵۶ء میں مسلسل دو ہفتے جاری رہا تھا اور جس میں جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر غور ہوا تھا' جب یہ فرمایا کہ ''میں ہر رکن شوریٰ کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس بیان کو ضرور پڑھے' اس کے مصنف نے ہماری ہی تحریروں سے مرتّب کر کے ایک آئینہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس میں ہم اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں'' تو میرے نزدیک یہ جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے طریق کار کے بارے میں میرےپیش کردہ تصور کی صحت پر آخری خارجی دلیل ہے۔

اورواقعہ یہ ہے کہ اس مفصل بیان کے تحریر کرنے سے بھی مقصودیہی تھا اور اب اس کی اشاعت سے بھی مطلوب یہی ہے کہ کسی طرح اس تحریک کی تجدید اور اس کے احیاء کی صورت پیدا ہو جسے لے کر جماعت اسلامی اُٹھی تھی لیکن جسے اس نے تاریخ کی ایک ہی کروٹ پر پیٹھ کے بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔

میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی

و جُہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدتِ ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرۂ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادتِ حق علی الناس کی

کوشش ہے۔ یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اسی طرح آج بھی حق ہے کہ اُمّت ِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس ہی یہ ہے کہ{کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ}(٦) اور{وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا}(٧)اور آج جب کہ یہ اُمّت بحیثیت مجموعی اپنے اس اصل فرضِ منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے‘ اس اُمّت میں سے صحیح راہ پر وہی ہیں جو کم از کم {وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾}(٨) کے مصداق بن جائیں۔

میرے نزدیک اگر آج سے پچیس سال قبل مسلمانانِ ہند تقریباً مجتمع ہو کر اپنے قومی و ملی تشخص کے تحفظ اور غیر مسلم اقوام کے معاشی و تہذیبی تسلط سے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے اور ان مقاصد کے لیے حصول پاکستان کی جدّوجُہد میں مصروف تھے تو نہ وہ کفر تھا اور نہ ہی اگر آج جماعت اسلامی نظریۂ پاکستان کی سب سے بڑی علمبردار بن کر تحریک مسلم لیگ کی وراثت حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے تو یہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گئی ہے ----- لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جب کہ ملی و قومی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے نہ پہلے کم تھے نہ آج مفقود ہیں‘ وہاں اس جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں رہا جو جماعت اسلامی نے اپنے انتقالِ موقف سے خالی کی ہے۔

_____(٦) سورۂ آلِ عمران‘ آیت ١١٠: ’’تم ہو بہتر سب اُمتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں‘ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)(٧) سورۃ البقرۃ‘ آیت ١٤٣: ’’اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)(٨) سورۂ آلِ عمران‘ آیت ١٠٤: ’’اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے ۔ اور وہی پہنچے اپنی مراد کو۔‘‘(ترجمہ شیخ الہندؒ)

حضور نبی کریم ﷺ فداہ ابی و اُمی کی حیاتِ طیبہ میں چند مواقع ایسے ملتے ہیں جن پر حضور ﷺ کے قلب مبارک میں انسانی جذبات بے اختیار امڈے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک موقع وہ ہے جب حضور ﷺ غزوۂ اُحد سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے دیکھا کہ پوری بستی عورتوں کے نوحے اور بین کی آواز سے گونج رہی ہے' اُس وقت حضور ﷺ کو بے اختیار اپنے عزیز اور محبوب چچا اور بچپن کے رفیق اور ساتھی بلکہ رضاعی بھائی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ یاد آئے اور وفورِ جذبات میں یہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکل گئے ''اما حمزۃُ فَلا بواکیَ لَہ ! !'' ---- ''آہ! حمزہؓ کا رونے والا کوئی نہیں ! !''--- بالکل یہی حال آج اس دین کا ہے جو ''بڑی شان سے'' جزیرہ نمائے عرب سے نکلا تھا لیکن آج ایسا ''غریب الغرباء'' بن گیا ہے کہ اس کے لیے رونے والا کوئی نہ رہا۔ فرمانِ نبویؐ: ''بَدَأَ الاِسْلامُ غَرِیبًا وَسَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ''، تو مجسم اور مشکّل نگاہوں کے سامنے موجود ہے لیکن آنکھیں اُن غرباء کو ترس رہی ہیں جو اس غربت اور اجنبیت کے دور میں اس غریب کے ہمدرد و مونس و غمخوار ہوں ! ---- اور فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاء (۹) کی نوید کے حق دار بن سکیں۔ یہ دین بیگانوں کی ناخوشی کا کیا شکوہ کرے جب کہ اس کے اپنوں کی خفگی کا یہ عالَم ہے کہ وہ اپنے قومی' ملکی اور ملی مسائل میں ایسے گم ہیں کہ انہیں اس کی ہمدردی تک کا وقت نہیں ملتا' اور اگر کبھی ان میں سے چند راہ رو چند قدم اس کے ساتھ چلتے بھی ہیں تو جلد ہی تھک ہار کر بیٹھ رہتے ہیں اور یہ پھر ویسے کا ویسا تنہا رہ جاتا ہے ! !

اگر میری اس تحریر کی اشاعت سے اس ''غریب الغرباء'' کے پرانے رفقائے سفر میں سے کچھ اس کی رفاقت پر از سرِ نو کمر ہمت کس لیں تو بس یہی اس کی اشاعت سے مطلوب ہے۔

تحریک جماعت اسلامی کے دورِ اوّل سے متعلق اپنی تحریر کے اختتام پر (اس

---

(۹) حدیث نبوی ﷺ : ''اسلام کی ابتدا غربت (اجنبیت) میں ہوئی اور جلد ہی یہ دوبارہ اجنبی ہوجائے گا ... تو مبارک باد ہو اجنبیوں کو !''

کتاب میں صفحہ ۹۴) مَیں نے عرض کیا تھا:

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی' اس لیے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہر حال موجود تھیں جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے اپنی محدود بصیرت کے مطابق کلام کرنا ہے ...''

لیکن اس وعدے کے پورا کرنے کی نوبت نہ آئی' اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس بیان کی تحریر کے فوراً بعد سے جماعت اسلامی کے حلقے میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور کسی معقول بات کے کہنے سننے کا موقع ہی نہ رہا ----- تاہم اس جگہ اس پر مختصر کلام مناسب ہے۔

میں لکھ چکا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب بیک وقت داعی دین بھی ہیں اور متکلم اسلام بھی اور ان کی دعوت کی رگ و پے میں فطری طور پر ان کے کلامی نظریات سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ مولانا مودودی اس دور کے متکلم ہیں جب کہ دنیا مختلف ''نظام ہائے حیات'' کے نظری و فکری ادوار سے گزر کر عملی زندگی کی نہج قرار پانے اور پھر ان کے باہمی تصادم کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں مولانا مودودی صاحب نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ انہیں ایک ''بہترین نظام حیات'' اور ''انسانی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل'' نظر آیا۔ چنانچہ یہی ان کی دینی فکر کا مرکزی نقطہ بن گیا جس کے یمین و یسار انہیں اسلام کے عقائد' اس کی عبادات اور اس کی شریعت کے تفصیلی احکام صف بستہ نظر آئے' اور اس طرح انہیں دین کا اصل مطالبہ یہ نظر آیا کہ اس نظامِ کلی کو نظامِ زندگی پر عملاً نافذ کر دیا جائے ---- یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن مولانا مودودی صاحب کی تحریروں پر ان کا اس قدر غلبہ ہے کہ دین کے دوسرے پہلو مثلاً بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اس میں عبدیت' انابت' اِخبات' تضرع اور اخلاص منجملہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ---- اور جماعت اسلامی کی تحریک میں فرد پر اجتماعیت' باطن پر ظاہریت' اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دُنیوی اس طرح چھا گئے کہ اس کے کارکنوں کی زبان پر اگرچہ ''نجاتِ اُخروی'' بھی رہی لیکن ان کی عملی سعی و جُہد کا اصل مرکز و محور دنیا میں ''اقامتِ دین'' بن کر رہ گئی۔

اس موضوع پر مفصل لکھنے کی نوبت شاید پھر کبھی آئے۔ اِس وقت میں اس قدر کافی سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک اہم سابق رکن اور وہاں کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر وحید الدین خاں صاحب کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' کا تذکرہ کردوں۔ اس کتاب کا اصل موضوع وہی ہے جو اوپر بیان ہوا اور اس پر خان صاحب موصوف نے جس قدر محنت کی ہے اور دین کے اس دوسرے پہلو کو جو جماعت اسلامی کی تحریک میں دب کر رہ گیا ہے جس طرح اُجاگر کیا ہے اس کے لیے وہ شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک خان

صاحب موصوف بھی فرد اور جماعت اور ظاہر و باطن کے مابین مقامِ عدل پر قائم نہیں رہ سکے ہیں بلکہ ان کی تحریر میں دوسرا پہلو قدرے غالب آ گیا ہے اور اجتماعیت کے حقوق مجروح ہوئے ہیں' تاہم کتاب کا مطالعہ' تصویر کے دوسرے رخ اور اس کی اہمیت کو نگاہوں کے سامنے لانے میں انتہائی مفید ہے ! !

''دورِ ثانی اور اس کی خصوصیات'' کا باب محض تقابل کے لیے ہے ! اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کے بعض حصوں کو حذف بھی کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں اس دیباچے میں مجھے مزید کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ میں نے اس حصے میں بھی جماعت اسلامی کی پالیسی پر اصولی تنقید کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان احوال و کوائف کا اس بیان کی تحریر کے وقت تک مجھے بہت ہی کم علم تھا جن کی تفصیلات جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیے جانے والے دوسرے بیانوں خصوصاً ملک سعید صاحب کے بیان میں درج تھیں۔ جائزہ کمیٹی کے بزرگ رکن جناب عبدالجبار غازی صاحب نے بعد میں ایک موقع پر مجھے بتایا کہ تمہارا بیان پڑھ کر میں نے اپنی ڈائری میں یہ الفاظ نوٹ کیے تھے:

''حیرت ہوتی ہے کہ یہ نوجوان جو ہمارے مقابلے میں جماعت اسلامی میں بالکل نو وارد کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے حالات اور واقعات کا علم بہت کم ہے' محض لٹریچر کے منطقی تجزیے سے ان نتائج تک پہنچ گیا ہے جن تک ہم بوڑھوں کی رسائی تمام حالات اور واقعات کے بچشم سر مشاہدے سے ہوئی ہے۔'' (روایت بالمعنیٰ)

جیسا کہ عرض کیا گیا' مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس بیان کی تحریر کے وقت

تک ان ''حالات و واقعات'' کا علم مجھے نہ ہونے کے برابر تھا جن پر مشتمل جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں ایک صاحب نے فرمایا تھا کہ ''جائزہ کمیٹی کی رپورٹ غلاظت کا ایک ٹوکرا ہے جس میں پوری جماعت میں جھاڑو پھیر کر اور اس کا گند سمیٹ کر جمع کر دیا گیا ہے !''

بیان کا آخری حصّہ ''تبدیلی کیوں؟'' ہے۔ اس موضوع پر اس بیان کی تحریر کے بعد اپنی اس تقریر میں جو مولانا مودودی صاحب نے فروری ۱۹۵۶ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماعِ ارکان میں کی تھی اور جو اب ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل'' کے نام سے طبع شدہ موجود ہے' مفصل کلام کیا ہے۔ لیکن ذرا تجزیہ کیا جائے تو وہ اس سے پانچ سال قبل کی تحریر ''جماعت اسلامی' اس کا مقصد' تاریخ اور لائحۂ عمل'' میں بیان کردہ وجوہات ہی کی مزید تشریح ہے اور ان کا تفصیلی جائزہ میں اپنے اس بیان سے لے چکا تھا' لہٰذا کسی مزید گفتگو کی حاجت نہیں ہے۔

کتاب کے آخر میں ''ضمیمہ'' کے طور پر میں نے تین قراردادوں کو جمع کر دیا ہے:

ایک اجتماع ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ میں راقم الحروف کی پیش کردہ قرارداد جو گویا کہ اس بیان کا خلاصہ ہے 'جو اس اجتماع میں بہت سی وجوہات کی بنا پر بری طرح ناکام ہوئی۔

دوسری وہ قرارداد جو جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض کے بعد مرکزی مجلس شوریٰ نے دسمبر ۱۹۵۶ء میں پاس کی تھی اور جو جماعت اسلامی کے ''مخلصین'' کی اس کوشش کا مظہر ہے کہ دو مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے گروہوں کو کسی طرح متفق کر کے جماعت کو انتشار سے بچایا جائے' اور جس میں ایک طرف اس خطرے کا سدِ باب کیا گیا کہ اگر یہ اعتراف کر لیا گیا کہ ہم نو دس سال ایک غلط راستے پر چلتے رہے ہیں تو نہ صرف یہ کہ جماعت کے کارکنوں کی ہمت شکنی ہو گی اور ان میں کام کرنے کا جذبہ باقی نہ رہے گا بلکہ جماعت کی قیادت پر سے ان کا اعتماد بالکل اٹھ جائے گا اور اس کا وہ وقار باقی نہیں رہے گا جو نظم جماعت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ''تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے'' کے بارے میں دو آراء کے امکان کو تسلیم کرنے اور ''بعض مضر نتائج'' کے برآمد ہونے

کے اقرار کے ساتھ ساتھ کارکنانِ جماعت کو اطمینان دلایا گیا کہ ''جماعت اپنے اصول' مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے''۔

دوسری طرف جماعت کی بعد از تقسیم کی پالیسی میں نہ صرف یہ کہ عدم توازن کا اقرار کیا گیا جس کی بنا پر جماعت کے ''بنیادی کام میں بڑی کسر رہ گئی ہے'' ----- بلکہ عملاً اس طریق کار کے ایک ستون یعنی انقلابِ قیادت

بذریعہ انتخابات کو بالکل ہی منہدم کر دیا گیا اور دوسرے ستون یعنی ''دستورِ اسلامی کے تحفظ' اصلاح اور نفاذ'' کے لیے بھی بس ''ناگزیر'' اقدامات کی اجازت برقرار رکھی گئی۔

اور تیسری مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ فروری ۱۹۵۷ء بمقام ماچھی گوٹھ کی وہ قرارداد جسے اجتماع ارکان میں مولانا مودودی صاحب نے پیش کیا اور جس کی تشریح میں مولانا نے دو نشستوں میں چھ گھنٹوں کی وہ مفصل تقریر کی جو اب ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل'' کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے ----- اس قرارداد نے جماعت کی بعد از تقسیم ہند کی پالیسی کی مکمل توثیق کی اور اسی پالیسی کو آئندہ کا لائحۂ عمل قرار دیا۔

اس قرارداد اور اس کی شارح تقریر پر یہاں تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے۔ صرف اس قدر عرض ہے کہ الفاظ کے گورکھ دھندوں اور منطقی استدلال کی پیچیدگیوں سے صرفِ نظر کر کے اس قرارداد اور تقریر کے بین السطور میں دیکھیے کہ آج سے نو دس سال قبل پاکستان میں تحریک اسلامی اس کے داعی کے بیان کے مطابق کس مقام تک پہنچ چکی تھی اور ایک نظر آج کے حالات اور نو دس سال کی مزید ''پیش قدمی'' کے بعد پاکستان میں اسلام یا تحریک اسلامی کی حالت زار پر ڈالیے تو شاید غیر اختیاری طور پر علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی جانب ذہن منتقل ہو جائے کہ ؎

محکوم ہے بے گانۂ اِخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

اس تحریر کو ختم کرتے ہوئے میں اپنے رکنیت جماعت سے استعفاء کے آخری دو

پیرے نقل کرنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ آج اس تحریر کی اشاعت سے پھر شاید میرے کچھ بزرگ اور دوست اسی طرح دل گرفتہ ہوں جیسے میرے مستعفی ہونے کے وقت ہوئے تھے ----- اُس وقت اِس سلسلے میں مَیں نے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا تھا' آج بھی میرے جذبات وہی ہیں:

''جماعت کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۴۷ء سے' شعوری ہمدردی کا تعلق ۵۱ء سے (جب کہ میں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گزشتہ سوا سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصے میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقے میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں' محبتیں

اور الفتیں' حتیٰ کہ رشتے داریاں تک اسی حلقے میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اُٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعۃً اس حلقے سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں' کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے ----- لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا !

مَیں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اُس وقت بھی اسے کوئی بچوں کا کھیل نہ سمجھا تھا۔ اور آج جب کہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں نہیں کر رہا۔ اپنے بیانِ جائزہ کمیٹی کے تحریر کرنے سے ایک سال قبل سے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں اور اس واقعے کو بھی آج چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں' مَیں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ بھی' اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ بھی دونوں ہی طرح مسلسل غور کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے راہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔

جب اندر آیا تھا تو رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا کے ساتھ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ کی دعا کرتا ہوا آیا تھا اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے وَ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔

جن حالات اور کیفیات سے گزر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے وہ میں نے اپنی حد تک صحیح صحیح اور صاف صاف بیان کر دیے ہیں۔ اس کے بعد بھی کسی ''نفسیاتی تجزیے'' کی ضرورت ہو تو جماعت کے کئی اہلِ قلم کو ماشاء اللہ اس میں مہارتِ تامہ حاصل ہی ہے۔ مَیں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ ایسے کسی تجزیے سے کوئی فائدہ ہی اٹھا سکوں۔

آخر میں دست بدعا ہوں: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَكَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَاُنْثَانَا ، اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْيَيْتَهٗ مِنَّا فَاَحْيِهٖ عَلَى الْاِسْلَامِ ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهٗ مِنَّا فَتَوَفَّهٗ عَلَى الْاِيْمَانِ۔

(تحریر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ بحالت اعتکاف)

اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں حق تلفی ہو گی اگر برادرم محی الدین سلفی صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جن کا اِصرار اس کی طباعت کا فوری محرک بنا اور جن کے عملی تعاون ہی سے اس کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ اس کتاب کی اشاعت اگر کسی خیر کا ذریعہ بنے تو یقیناً وہ اس کے ثواب میں سے حصّہ پائیں گے اور کوئی شر اس سے پیدا ہوا تو وہ صرف میرے ''شرورِ نفس'' کی وجہ سے ہو گا' وہ اس سے بَری ہیں ----- فقط

خاکسار اسرار احمد

لاہور۔ مارچ ۱۹۶۶ء

مقدّمہ

* ابتدائیہ

کچھ اپنے بارے میں

اعتذار

ابتدائیہ

ہر وہ خیال جو صفحۂ قرطاس پر پیش کیا جائے، زیادہ نہیں تو بہر حال تھوڑی بہت سوچ بچار اور ذہنی کشمکش کی منزلیں طے کر کے اس حد تک پہنچتا ہے کہ اسے متعین الفاظ کے ساتھ پیش کیا جا سکے!

صفحاتِ آئندہ میں مَیں جن خیالات کا اظہار کر رہا ہوں وہ بھی ذہن میں کوئی آج ہی پیدا نہیں ہو گئے ہیں بلکہ یہ بھی سوچ بچار کی بہت سی منازل طے کرنے کے بعد آج اس قابل ہوئے ہیں کہ انہیں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

یہ پورا عرصہ جس میں یہ خیالات ذہن کا بار بنے رہے ہیں، میںنے ایک شدید ذہنی کشمکش اور روحانی اذیت میں گزارا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ایسی چیز کہ جس کے لیے ایک شخص پوری زندگی کی بازی کھیلنے کو تیار ہو اور جس کے لیے نقدِ جان پیش کر چکا ہو، اگر اسی کی طرف سے ذہن مطمئن نہ رہے اور دلی اطمینان باقی نہ رہے تو اس سے زیادہ اذیت بخش چیز اور کون سی ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تقریباً پورا ایک سال کا عرصہ مجھ پر ایسا گزرا ہے کہ جس میں فرصت کے تمام لمحات اسی سوچ بچار میں گزرے ہیں۔ دنیا کی دوسری مصروفیات نے جب بھی ذہن کو ذرا مہلت دی ہے، یہ خیالات فوراً آ موجود ہوئے ہیں اور اُس وقت تک ذہن میں ڈیرہ جمائے رہے ہیں جب تک کہ کسی اور ناگزیر ضرورت نے توجّہ اپنی جانب مبذول نہیں کرا لی ہے۔

اس دوران میں کئی بار جب یہ مواد ذہن میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک اُٹھتا تھا تو خیال آتا تھا کہ جماعت کے کسی ذمہ دار شخص کے سامنے یہ سارا معاملہ رکھ کر ذہن کا بوجھ ہلکا کر لوں، لیکن دو وجوہات کی بنا پر یہ ارادہ عمل کا جامہ نہ پہن سکا۔

ز اولاً ع ''ایاز قدرِ خود بشناس'' والا معاملہ کہ کہاں میں اور کہاں یہ باتیں۔ آخر یہ

پوری جماعت اکابر اور اصاغر سمیت جو ایک سمت میں چلی جا رہی ہے تو آخر کوئی تو بات ہے کہ جس کی کُنہ تک میں نہیں پہنچ سکا ہوں۔ اتنے عظیم مرتبہ علمی کے لوگ جب اس راستے پر چل رہے ہیں تو ضرور یہ راستہ درست ہی ہو گا، مَیں اپنی کوتاہ بینی اور کم فہمی کی بنا پر اسے سمجھ نہیں سکا ہوں۔ پھر خیال آتا کہ بات تو کرو، اور کچھ نہ ہوا تو کم از کم اپنی غلطی تو تم پر واضح ہو ہی جائے گی۔ ایک مرتبہ تو اس خیال نے اس قدر زور باندھا کہ محض اس سلسلے میں گفتگو کرنے کی غرض سے مَیں ملتان جیل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ لیکن کچھ اس وجہ سے کہ ننھائی اور تخلیہ میسّر نہ آ سکا اور زیادہ تر مولانا کے علمی دبدبے کی بنا پر کھل کر بات نہ ہو سکی۔ صرف ایک سوال کر سکا کہ ''مولانا! ۴۷ء میں جو راستہ اختیار کیا تھا اسے کب تک آزمانے کا ارادہ ہے؟'' اس کا جو جواب مولانا نے دیا وہ یہ تھا کہ ''مَیں ابھی تک اس راستے کے لیے دروازے بند نہیں پا رہا ہوں!''

ز ثانیاً مَیں یہ محسوس کرتا تھا کہ مَیں اپنی آراء میں منفرد ہوں۔ پوری جماعت میں کوئی میرا ہم خیال موجود نہیں ہے! اس نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا! اس خیال سے مجھے خود اپنے موقف پر پورا اعتماد نہ ہوتا تھا اور اس کے باوجود کہ جہاںتک عقل کم کرتی تھی مجھے اپنی بات صحیح ہی معلوم ہوتی تھی، اس کے کہہ گزرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہر بار زبان کو یہ خیال واہو نے سے روک دیتا تھا کہ ؎

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

عام اسلوبِ بیان میں اسے اتفاقاً ہی کہا جائے گا لیکن ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے یہ بہر حال اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت ہی کے تحت ہوا کہ میری ملاقات جناب محمد اجمل خاں لغاری صاحب (۱۰) سے ہو گئی۔ ان کے ساتھ ایک طویل گفتگو ہوئی جس کا ماحصل یہ

_____(۱۰) جناب سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری' رحیم آباد ضلع رحیم یار خان کے رئوسا میں سے ہیں اور جماعت اسلامی کے اولین ارکان میں سے ہونے کے علاوہ ریاست بہاول پور میں غالباً جماعت اسلامی سے روشناس اور منسلک ہونے والے پہلے آدمی آپ ہی ہیں۔ جماعت ...

ہے کہ نہ صرف یہ کہ مَیں نے یہ محسوس کیا کہ ع
''گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!''
بلکہ معلوم ہوا کہ یہ محفل تو رازدانوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ پہلی ہی گفتگو میں ہر وہ بات کہ جو وہ کہتے تھے اس پر مَیں اپنے دل میں اور ہر بات جو مَیں کہتا تھا اس پر وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ؎
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بہر حال اس انکشاف سے کہ جماعت میں ایک خاصی بڑی تعداد میں ارکان اسی طرز پر سوچ رہے ہیں ایک گونہ اطمینان اور اپنی بات پر قدرے اعتماد پیدا ہوا اور میں نے طے کیا کہ آنے والے سالانہ اجتماع میں اپنی رائے پیش کروں گا۔ (۱۱)
مَیں نے سوچا تھا کہ سالانہ اجتماع کے موقع پر اجتماعِ ارکان میں پیش کرنے کے لیے ایک تحریر تیار کر لوں گا لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ ہوا اور اجتماع سے ایک ماہ قبل سے چند حوادث نے جو اپنے نرغے میں لیا تو سارا وقت انہی کی نذر ہو گیا اور اجتماع سر پر آگیا اور تحریر تیار نہ کی جا سکی۔ چنانچہ اجتماع میں ایک بوجھل دل کے ساتھ ''خالی ہاتھ'' حاضر ہو گیا۔

وہاں اجمل صاحب ہی نے یہ انتہائی دل خوش کن خبر سنائی کہ جماعت کی موجودہ پالیسی اور طریق کار سے اختلافات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آگیا ہے۔ چنانچہ اطمینان ہو گیا کہ موقع ہاتھ سے نکل نہیں گیا بلکہ اب ایک زیادہ پُر سکون ماحول میں اور زیادہ اطمینان کے ساتھ بات کہنے کا موقع میسّر آسکے گا۔
سالانہ اجتماع (نومبر ۱۹۵۵ء' کراچی) سے واپسی کے بعد سے اب تک ان

_____..... اسلامی کی بعد از قیام پاکستان کی حکمت عملی کے بارے میں آپ ابتدا ہی سے مضطرب رہے... اور بالآخر غالباً ۱۹۵۹ء میں جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔
(۱۱) اجمل صاحب سے میری ملاقات سالانہ اجتماع نومبر ۱۹۵۵ء سے دو ایک ماہ قبل حلقہ اوکاڑہ کے اجتماعِ ارکان منعقدہ اوکاڑہ میں ہوئی تھی۔

مسائل پر متعدد اراکین جماعت سے تفصیلی گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں۔ آپس کے افہام و تفہیم نے معاملے کے بہت سے ان گوشوں کو بھی نظر کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے جو اب تک اَوجھل رہ گئے تھے۔

اب جب کہ جائزہ کمیٹی کے منٹگمری آنے کی خبر مل گئی ہے 'اس تحریر کی ابتدا کی جرأت محض اللہ تعالیٰ کی امداد کے بھروسے پر کر رہا ہوں۔ واقعہ ہے کہ قطعاً سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کام میں کیسے کر سکوں گا۔ اولاً اتنے اہم مسائل ---- اور میری کم علمی اور نا تجربہ کاری ! ! ثانیاً فن تحریر سے نا بلد محض ہونا کہ انسان اپنے ما فی الضمیر کو ادا بھی نہ کر سکے !تاہم ایک احساسِ فرض ہے کہ جس نے ابتدا کر دی ہے وَاللّٰہُ المُستعان ومَا تَوفِیقی اِلَّا بِاللّٰہِ العَلِیِّ العظیم۔

اسرار احمد

مورخہ ۲۷؍ اگست ۵۶ء

۱۱ بجے شب

کچھ اپنے بارے میں

اس موضوع پر کچھ عرض کرنے کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر محسوس ہوئی:

ز ایک یہ کہ صفحاتِ آئندہ میں جماعت اور اس کے ان اکابر پر کہ جو اس کی راہنمائی کر رہے ہیں تنقید آ رہی ہے اور یہ چیز ممکن ہے کہ میرے بارے میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دے۔ بنا بریں میں نے محسوس کیا کہ ابتدا ہی میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں تو اچھا ہے۔ مَیں یہ گزارشات پیش کر کے اپنی طرف سے ایک کوشش کر رہا ہوں کہ میری بات کو زیادہ ہمدردی کے ساتھ سنا جا سکے۔

ز دوسرے یہ کہ سننے میں آیا ہے کہ جائزہ کمیٹی نے جو سوال نامہ مرتب کیا ہے اس میں ایک سوال رائے دینے والے شخص کی ذات اور اس کے تعلق ِجماعت کے ساتھ بھی بحث کرتا ہے۔ بحیثیت رکن ‘جماعت اسلامی کے ساتھ میرے تعلق کی میعاد کل ڈیڑھ سال ہے‘ لیکن حقیقتاً جماعت کے ساتھ میرا تعلق ۱۹۴۷ء سے ہی بالکل رکن کا سا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کو بھی بالوضاحت پیش کر دوں تاکہ میری بات یکے از ’’تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل‘‘ کی بات سمجھ کر نظر انداز نہ کر دی جائے!

میری زندگی کے مختلف ادوار حسب ِذیل ہیں:

*پیدائش (اپریل ۱۹۳۲ء) سے میٹرک پاس کرنے تک (۱۹۴۷ء) کا زمانہ مَیں نے ضلع حصار مشرقی پنجاب میں گزارا۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام اور اس کی زندگی کے اوّلین سال تو میری بالکل بے شعوری اور نا سمجھی کا زمانہ تھا۔ ۴۷- ۱۹۴۶ء میں جب کہ مَیں میٹرک میں پڑھ رہا تھا‘مسلمانانِ ہند کے اعصاب پر مسلم لیگ کی تحریک پورے طور پر مسلط تھی اور یہی اس کا تسلط کچھ سمجھ اور کچھ بے سمجھی کے ساتھ میرے دل و دماغ پر بھی تھا۔ تاہم اس زمانے ہی میں میرے کان میں جماعت اسلامی کی دعوت بھی

پڑچکی تھی۔ جناب مسرت مرزا صاحب (حال ملتان)‘ جناب چودھری نذیر احمد صاحب (حال ملتان) اور جناب غلام محمد بھٹی صاحب کے ذریعے میں جماعت سے متعارف ہوا اور کم از کم اس کا اس حد تک مداح ضرور بن گیا کہ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جس کا میں ایک Active Worker اور Office Bearer تھا) کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودی صاحب پر کوئی طنز کیا جاتا تو میں ان کی طرف سے اپنا پورا زور مدافعت میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب اس زمانے میں جماعت کے لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہے تھے (اور اسی مطالعے کے نتیجے میں وہ ۱۹۴۸ء میں جماعت کے رکن بھی بن گئے)۔

* حصار سے لاہور آتے ہی یعنی قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مَیں نے بھی جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا اور جماعت لاہور کے حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً وابستہ ہو گیا۔ جناب ماسٹر شہاب الدین صاحب جو ابھی تک کرشن نگر لاہور ہی میں مقیم ہیں‘ ہمارے حلقہ کے ناظم تھے اور ان کے ساتھ اس زمانے میں (یعنی ۴۹- ۱۹۴۸ء جب کہ مَیں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں زیر تعلیم تھا) مَیں نے اَن تھک کام کیا۔ یہ زمانہ جماعت کے مطالبۂ اول کی مہم کا زمانہ تھا اور مَیں نے اس زمانے میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن مَیں جماعت کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق اور وابستگی کو بے شعوری کا تعلق اور وابستگی قرار دیتا ہوں۔ ایک عام کارکن کی طرح اگرچہ میں بھی بھاگ دوڑ میں پوری طرح حصّہ لیا کرتا تھا لیکن تحریک کے ساتھ میرا یہ تعلق سطحی تھا اور میں ابھی پوری طرح اسے سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ تاہم اس بات کا احساس بھی مجھے جلد ہی ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۹ء کے اواخر میں مَیں میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور اس وقت سے مَیں نے جماعت اور تحریک کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تو اپنے تعلق کا سطحی ہونا واضح ہوا اور جماعت کی دعوت اپنی پوری گہرائی کے ساتھ دل و دماغ پر منکشف ہوئی۔ چنانچہ اسی زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک اجتماع میں مَیں نے ذیل کے الفاظ کہے تھے:

’’خود اپنے حالات کے مشاہدے اور چند قریبی دوستوں کے مطالعے سے جو کچھ

مَیں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری بنیادی کمزوری یہ رہی ہے کہ ہم نے تحریک اسلامی کی بنیادی دعوت کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ یہ بات بادی النظر میں آپ کو کافی غلط سی معلوم ہوگی لیکن حقیقت میں معاملہ کچھ ایسا ہی ہے.....

..... حقیقت یہ ہے کہ ہم نے دو چار کتب کے مطالعے سے یہ سمجھ لیا کہ ہم اپنے مسلمان ہونے کا مفہوم جان گئے ہیں۔ تحریک اسلامی کے چند اجتماعات میں حاضر رہ کر ہم نے یہ سمجھا کہ ہم تحریک کی دعوت کو سمجھ گئے ہیں اور پھر اس محدود تصوّر کے ساتھ اپنے ''فرض'' کا جو نظریہ ہم نے قائم کیا وہ یہ تھا کہ دو چار پمفلٹ اِدھر اُدھر بانٹ کر اور محض ذہنی تعیش کے لیے دو چار بحث نما گفتگوئیں کر کے ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک میں اپنا حصہ بھی ہم نے ادا کر دیا .....

..... طلبہ کی اس اسلامی تحریک (۱۲) کی سرگرمیوں میں بھی مَیں نے حصّہ لیا ہے جس کی دعوت پر آج ہم جمع ہوئے ہیں اور کالجوں کی فضا سے باہر کے اسلام پسند عناصر(۱۳) کے ساتھ بھی میں نے کام کیا ہے' لیکن اس لیے نہیں کہ میرے ذہن میں خدا کی بندگی کا تصور راسخ تھا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ تھا جو مجھے لیے لیے پھر رہا تھا بلکہ اس لیے کہ خدا کے ان بندوں میں سے جو تحریک اسلامی کا عَلم اٹھائے ہوئے تھے کچھ لوگوں کی تحریریں مجھے پُر زور معلوم ہوئی تھیں اور مَیں ان سے مرعوب سا ہو گیا تھا کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں صحیح ہے یا پھر کچھ لوگوں کی تقریروں کا مجھے چسکا پڑ گیا تھا کہ جہاں مَیں نے سنا کہ فلاں صاحب کی تقریر ہے مَیں فوراً پہنچ گیا یا پھر اس تحریک کے کارکنوں کو کتب اور پمفلٹ تقسیم کرتے دیکھ کر مَیں بھی دو چار پمفلٹ اِدھر سے اُدھر کر دیا کرتا تھا اور اس تحریک کی حمایت میں اس کے مخالفین سے پُر زور مباحثے کر لیا کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ بھئی ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے ..... '' (شائع شدہ ''عزم'' ۱۵، نومبر ۱۹۵۰ء)

اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے تعلق تحریک کے اس تجزیے کے بعد آئندہ کے لیے جو مشورے مَیں نے دیے تھے (اور یہ صرف دوسروں کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو بھی تھے)' وہ یہ ہیں:

---

(۱۲) اسلامی جمعیت طلبہ (۱۳) جماعت اسلامی

''اصل چیز تحریک کی بنیادی دعوت ہے اور یہ وہی دعوت ہے جو ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے آقا ' مالک اور معبود کی حیثیت سے پہچانیے اور تسلیم کیجیے۔ اس کی ہدایت کو ہدایت مانیے اور پھر اپنی پوری زندگی کو اس کی عبادت میں دے دیجیے !..... اپنے اور خدا کے درمیان تعلق کو استوار کیجئے اور خدا کے خوف کو اپنے دل میں جاگزیں کیجئے' یہی وہ کمپاس ہے جو آپ کی زندگی کے لیے صراطِ مستقیم متعین کرے گی ۔ خدا کی رضا کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنایئے' یہی وہ طاقت ہے جو گمراہی کے اس تاریک ماحول میں بڑی سے بڑی تکالیف کے باوجود آپ کو صراطِ مستقیم پر گامزن رکھے گی !.....'' (ایضاً)

بہر حال یہ میری زندگی کے شعوری دور کی ابتدا تھی۔ اسی زمانے میں مَیں اسلامی جمعیت طلبہ کا رُکن بن گیا۔

* ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک میں اسلامی جمعیت طلبہ کا رُکن رہا اور اس میں مَیں نے ایک عام کارکن اور رکن سے لے کر اس کی نظامت ِعلیا تک کے فرائض سر انجام دیے۔ جو حضرات مجھ سے اُس دور میں واقفیت رکھتے تھے ان کو معلوم ہے کہ میں نے اس پورے عرصے میں جمعیت اور اس کے کام کو اپنی زندگی میں ہر چیز حتیٰ کہ اپنی تعلیم تک پر مقدّم رکھا ہے۔ یہاں تک کہ میرے طالب علم ساتھی میری اس محویت اور مشغولیت کی زیادتی کے ہمیشہ شاکی ہی رہے ---- لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس پورے چار سال کے عرصے میں ایک دن بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ جس میں مَیں نے جمعیت کو (اصول اور تحریک کی حد تک) جماعت سے علیحدہ کوئی چیز سمجھا ہو۔ مَیں اپنی حد تک اسلامی جمعیت طلبہ کو تنظیمی طور پر تو ضرور آزاد اور جماعت سے علیحدہ سمجھتا رہا ہوں لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے اس پورے دور میں مَیں نے اپنے آپ کو جماعت اسلامی ہی کا ایک رکن متصور کیا۔ مجھے جو احساسِ فرض جمعیت میں اپنا وقت اور محنت صرف کرنے پر مجبور کرتا رہا' وہ حسب ِذیل ہے:

''اس سلسلے میں جو کچھ مَیں نے سمجھا ہے اور جس پر مَیں خود عمل پیرا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اصولاً دین کے مطالبات طلبہ سے بھی وہی ہیں کہ جو عام لوگوں سے ہیں۔ دینی فرائض کے اعتبار سے طلبہ اور عام لوگوں میں کوئی امتیازی فرق موجود نہیں

ہے..... دین میں صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے شعور اور غیر شعور کی تقسیم۔ سن شعور کو پہنچنے سے قبل غیر شعوری حالت میں انسان کسی بھی چیز پر مکلف نہیں ہے۔ لیکن سن شعور کو پہنچ جانے کے بعد جب کہ انسان میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت پیدا ہو جائے وہ ان تمام فرائض پر مکلف ہو جاتا ہے جو اسلام انسان پر عائد کرتا ہے ...

یہ فرائض کیا ہیں؟ مختصر طور پر اگر بیان کیا جائے تو یہ فرائض دو ہیں:

(i) انسان اپنے مالک حقیقی کو پہچان کر اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع فرمان کردے اور اپنی خود مختاری سے اس کی اطاعت کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ یہ وہ عبادتِ الٰہی ہے کہ جس کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کے لیے واحد لائحہ عمل ٹھہرایا ہے۔

اگر اسلامی ریاست قائم ہو اور شہادتِ حق اور نمائندگی اسلام کا فرض یہ ادارہ سر انجام دے رہا ہو تو افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ کی اطاعت کے طریقے کو اپنا کر، تمام فرائض کو بجا لا کر، برائیوں سے بچ کر اور نیکیوں کا اتباع کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اقامت ِدین اور شہادتِ حق کی ذمہ داری فرداً فرداً افراد پر عائد نہیں ہوتی۔

(ii) لیکن اگر اللہ کا دین بالفعل قائم نہ ہو بلکہ طاغوت غالب ہو تو پھر ہر اُس فرد پر کہ جو ایمان کا دعویٰ کرے اپنی انفرادی زندگی میں ''عبادت'' کے طریقے کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ شہادتِ حق اور اقامت ِدین کی ذمہ داری بھی عائد ہوجاتی ہے۔ اور یہ وہ دوسرا بڑا فرض ہے کہ جس پر ہر فرد مکلّف ہو جاتا ہے اور جس کی ادائیگی وہ تمام شرائط کے ساتھ اور صحیح صحیح طریقے پر نہ کرے تو اس کی انفرادی طاعت گزاری اور نیکو کاری بھی اس کے لیے بے کار ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں شہادتِ حق اور اقامت ِدین کوئی اضافی نیکی نہیں ہوتی بلکہ عین بنیادی فرض ہے کہ جس کی ادائیگی پر ایمان کے معتبر ہونے کا انحصار ہے! ...

ظاہر بات ہے کہ جس دور میں ہم جی رہے ہیں وہ طاغوت کا دور ہے۔ اللہ کا دین قائم نہیں ہے اور اسلامی ریاست کا کہیں وجود نہیں ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں میں سے جو بھی شعور کو پہنچتا ہے اور غیر مسلموں میں سے اللہ جسے بھی قبول

حق کی توفیق دیتا ہے اس کے لیے ایک ہی راہ ہے جس پر وہ اللہ اور اس کے دین کی طرف سے مکلّف ہے اور وہ یہ کہ اپنی انفرادی زندگی کو اللہ کی عبادت میں دے دے اور اپنے وقت اور اپنی محنت اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا بس تھوڑا سا حصّہ اپنی معاش کے لیے رکھ کر باقی سارے کا سارا شہادتِ حق اور اقامت ِدین کے لیے اجتماعی جدّوجُہد میں کھپا دے ...

دین کا یہ مطالبہ ہر اس شخص سے ہے جو شعور رکھتا ہو اور وہ ان فرائض پر اسی دم مکلّف ہو جاتا ہے جس دم کہ یہ فرائض اس پر واضح ہوجائیں ... اب خواہ وہ ایک طالب علم ہو یا زندگی کے اس دور سے گزر چکا ہو، اس کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ وہ ان فرائض کی انجام دہی میں لگ جائے۔ کسی کا طالب علم ہونا اسے ان فرائض میں سے کسی ایک سے بھی exempt نہیں کر دیتا اور دین میں اس طرح کی کسی تفریق کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔''

(تحریر جنوری ۱۹۵۴ء)

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ واضح ہو سکے کہ مَیں اپنی رکنیت جمعیت کے دوران بھی تحریک جماعت اسلامی ہی کا ایک سپاہی تھا۔

پھر میرا یہ دور چونکہ لاہور میں گزرا جہاں جماعت کا مرکز بھی ہے لہٰذا مجھے جماعت کے اکابرین کے ساتھ ملاقاتوں، گفتگوؤں اور نشست و برخاست کا وافر موقع ملا۔ اور اس پورے دور میں مَیں مولانا مودودی صاحب اور مولانا اصلاحی صاحب سے ذاتی ربط قائم کیے رہا۔ اس سے قبل ان حضرات کی صرف تحریریں پڑھی تھیں لیکن اس عرصے میں ان کے ساتھ ذاتی ربط سے مجھے وہ کچھ حاصل ہوا کہ جو محض تحریر پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

*۱۹۵۴ء کے اکتوبر میں، میں ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کر کے تعلیم سے فارغ ہوا۔ نتیجہ برآمد ہوتے ہی پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفاء دے دیا اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے بعد یعنی ۱۵؍ نومبر ۱۹۵۴ء کو مَیں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دے دی۔ میری درخواستِ رکنیت کا یہ اقتباس قابلِ توجّہ ہے:

''مَیں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس

کر رہا ہوں کہ اقامتِ دین میرا فرض ہے اور خدا کا شکر ہے کہ مَیں اس دور میں پیدا ہوا جب کہ خالصتاً اقامتِ دین کے کام کے لیے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے۔ اور مَیں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لیے ایک نعمت تصوّر کرتا ہوں، اس لیے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو خود کام کرنا میرے بس میں نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس کڑی ہو جاتی! چار سال میں جمعیت طلبہ میں رہا ہوں تو اسی تصوّر کے تحت کہ یہاں کام کر کے میں در اصل جماعت اسلامی ہی کا کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مَیں نے واضح طور پر مولانا مودودی صاحب امیر جماعت سے استفسار کر کے ان کی رضا مندی حاصل کر لی تھی اور اب جب کہ دورِ طالب علمی کے اختتام پر میں جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہو چکا ہوں تو اپنی پہلی فرصت میں یہ درخواست رقم کر رہا ہوں۔ چاہتا تو مَیں یہ تھا کہ جس روز جمعیت طلبہ سے علیحدہ ہوں اسی روز جماعت کی رکنیت کی درخواست دے دوں اور ایک دن بھی مجھ پر جماعتی زندگی کے بغیر نہ گزرے لیکن صرف اس وجہ سے کہ معلوم نہ تھا کہ کہاں settle ہوں گا اور کہاں درخواست دینی چاہیے، تقریباً پندرہ دن کی دیر ہو گئی ہے۔ بہر حال آج یہ درخواست دے دینے کے بعد مَیں مطمئن ہوں گا کہ مَیں نے اپنی طرف سے اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لیے پیش کر دیا ہے اور اس حیثیت سے جب تک میری رکنیت منظور ہو اس وقت تک بھی اپنے طور پر مَیں جماعت کے بغیر زندگی بسر نہیں کر رہا ہوں گا۔''

(درخواست رکنیت جماعت، تحریر ۱۵، نومبر ۱۹۵۴ء)

نومبر ۱۹۵۴ء میں درخواست رکنیت پیش کر دینے کے بعد ہی مَیں نے فوراً جماعت کے ارکان کی طرح اپنے آپ کو نظم کا پابند بنا کر کام شروع کر دیا۔ مَیں اُس وقت اپنی زندگی کے دو انتہائی نازک مراحل سے گزر رہا تھا۔ اولاً اب میری معاشی زندگی کی ابتدا ہو رہی تھی، ثانیاً مجھے اب معاشرتی بندھنوں میں بھی بندھنا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ طالب علمی کے دور ہی سے مجھے ان دونوں مراحل کی نزاکت کا احساس تھا اور اس احساس کو اس مشاہدے نے مزید شدید بنا دیا تھا کہ بہت سے لوگوں

نے کہ جو زمانہ طالب علمی میں جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن بلکہ رُکن تک رہے ان دونوں مراحل میں سے کسی ایک کو عبور کرتے ہوئے تحریک کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ مجھے خود اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی اور مَیں اپنی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا مانگتا رہا تھا ------ اور آج جب کہ مَیں محسوس کرتا ہوں کہ مَیں ان دونوں مراحل کو کامیابی کے ساتھ طے کر آیا ہوں تو میرے دل کی گہرائیوں سے صدا نکلتی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

در حقیقت تو یہ خدائے بخشندہ ہی کا فضل و کرم ہے لیکن بظاہر مجھے یہ اس بات کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے کہ میں نے جمعیت کے نظم سے آزاد ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو جماعت کے ساتھ باندھنے میں عجلت سے کام لیا۔ اگر مَیں اس میں ڈھیل دے دیتا اور جماعت کے ساتھ تعلق استوار کرنے میں دیر لگا دیتا تو حالات کا مقابلہ کرنا نسبتاً دشوار ہو جاتا۔

بہر حال فروری ۱۹۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہو گئی۔

*آج میری رکنیت جماعت کو بھی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے ---- اس عرصے میں اگرچہ (جیسا کہ آگے معلوم ہو گا) مجھے جماعت کی موجودہ پالیسی سے جلد ہی اختلافات ہو گئے تھے تاہم ایک لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور تحریک کے اصول کے بارے میں کوئی شک دل میں پیدا ہوا ہو اور اس کے باوجود کہ میں اپنے اختلافات کا اظہار برملا کرتا رہا ہوں اور آس پاس کے اراکین جماعت اس سے بخوبی واقف ہیں لیکن جماعت اور اس کے کام کے لیے سرگرمی اور محویت میں میرے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے ---- آئندہ کے لیے اس دعا کا سہارا لیا کرتا ہوں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً۔

اپنے بارے میں ان تصریحات سے مجھے در اصل دو باتوں کی وضاحت مطلوب تھی۔ وہ یہ ہیں:

ایک یہ کہ مَیں جماعت اسلامی میں نووارد سہی لیکن تحریک اسلامی کے ساتھ میرا تعلق نیا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ میرے شعوری تعلق کا عرصہ بھی کم از کم چھ سال ہے اور پھر جیسا کہ میری ۱۹۵۰ء والی تقریر کے اقتباس سے ظاہر ہے' میں نے اسی وقت جماعت کے ساتھ اپنے بے شعوری او جذباتی تعلق کو شعوری طور پر ختم کر کے اس تحریک کی بنیادی دعوت کو سمجھ کر قبول کیا تھا ---- لہٰذا میری بات کو ایک نو وارد کی بات سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے بلکہ اس پر کم از کم اتنی توجہ ضرور صَرف کی جائے جتنی کسی ''پرانے خدمت گار'' کی بات پر کی جاتی ہے !

دوسرے یہ کہ مَیں نے شہادتِ حق اور اقامت ِدین کو اپنے فرائض سمجھ کر ان کی ادائیگی کے لیے جماعت کا دامن تھاما ہے۔ جماعت میں جو کام میں کرتا ہوں وہ جماعت کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کرتا ہوں اور اس کے مسائل کو اس کے نہیں بلکہ اپنے مسائل سمجھ کر میں نے ان پر غور کیا ہے۔ پھر یہ کہ میں نے اس کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کو وابستہ کیا ہے۔ میں اس کے بغیر اپنے وجود کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میری ان گزارشات کو lightly نہ لیا جائے بلکہ اگر یہ جماعت کے ذمہ دار حضرات کو لایعنی اور بے کار نظر آئیں تب بھی ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ میری بات نہ مانی جائے تو کم از کم مجھے سمجھایا تو جائے کہ میری غلطی کہاں ہے اور میرے طرزِ فکر میں ٹیڑھ کس جگہ واقع ہوا ہے۔ اس میں جماعت اور تحریک کا کوئی فائدہ نہ سہی لیکن یہ ذاتی طور پر مجھ پر ضرور ایک احسان ہو گا۔

ایک بات کی وضاحت اور ضروری ہے اور وہ یہ کہ میں اپنے بارے میں قطعاً کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ یہ چونکہ جماعت کا ایک تنقیدی جائزہ ہے لہٰذا لا محالہ اس میں جماعت کے اکابر پر بھی تنقید آ رہی ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب خدارا ہرگز نہ لیا جائے کہ میں ان حضرات کے مرتبۂ علمی و دینی سے نا واقف ہوں یا میرے دل میں ان حضرات کی

عزت یا قدر و منزلت نہیں ہے یا یہ کہ میں اپنے آپ کو ان حضرات کے مقابلے میں کوئی درجہ دیتا ہوں۔ مَیں نے جماعت اسلامی کی گود میں آنکھ کھولی ہے۔ اور جس طرح ایک بچہ سب کچھ اپنی ماں سے سیکھتا ہے اسی طرح میں نے ان حضرات کی آنکھوں سے دیکھنا' ان کے کانوں سے سننا' ان کے دماغوں سے سوچنا اور ان کی زبانوں سے بولنا سیکھا ہے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے ان حضرات ہی کا فیض ہے اور ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ میں یہ

الفاظ کہتے ہوئے قطعاً تکلّف اور تصنع یا مبالغے سے کام نہیں لے رہا کہ مَیں اپنے آپ کو ان حضرات کی خاکِ پا کے ہم وزن بھی نہیں پاتا۔

پھر جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ بھی ان حضرات ہی کی تعلیم ہے اور سب کچھ ان ہی سے سیکھا ہوا ہے۔ لیکن کہنے پر مجبور اس لیے ہو گیا ہوں کہ ذہن ہر پھر کر اسی طور پر سوچتا ہے اور اب کہے بغیر چارہ نہیں رہا' اس لیے کہ اپنے ذہن کو معطل کر کے رکھ لینا میرے بس میں نہیں ہے۔

پھر اللہ گواہ ہے کہ اس بات کے کہنے میں کوئی بُری نیت محرک نہیں بنی ہے۔ اس غرض سے یہ گزارشات پیش کر رہا ہوں کہ اگر اس ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہماری غلطی کو (اگر وہ ہے!) واضح کر دے تو فبہا' ورنہ کم از کم مجھ پر تو اپنی غلطی واضح ہو جائے گی اور مَیں زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ تحریک اسلامی کے ساتھ وابستہ ہو کر عملاً کام کر سکوں گا۔

وَ اللّٰہُ شَاھِدٌ عَلٰی مَا فِی قَلْبِی!

* * *

اعتذار

۳۰ ستمبر کو اوکاڑہ میں جائزہ کمیٹی سے ملاقات کا موقع میسّر آیا۔ یہ تحریر اُس وقت تک مکمل نہ ہو سکی تھی' لہٰذا میں نے زبانی اپنے خیالات کا اظہار جس طرح بن آیا' کیا۔ اور اب یہ تحریر مکمل کر رہا ہوں۔

جناب شیخ سلطان احمد صاحب (رکن جائزہ کمیٹی) نے ہدایت فرمائی تھی کہ مَیں اپنے ما فی الضمیر کے اظہار میں اختصار سے کام لوں۔ لیکن بوجوہ میرے لیے اس ہدایت پر عمل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اولاً اس بناء پر کہ قدرتِ کلام کہ جس سے ''مَا قَلّ وَ دَلَّ'' والا معاملہ بن سکے' مجھے میسّر نہیں ہے اور ثانیاً اس بنا پر کہ مجھے دلی اطمینان مطلوب ہے اور وہ اس وقت تک حاصل نہ ہو سکے گا جب تک مَیں اپنی بات کو وضاحت سے کہہ کر مطمئن نہ ہوجائوں کہ میں نے اپنی بات کہہ دی ہے!!

''جائزہ کمیٹی'' کا مرتّب کردہ سوال نامہ بھی اب پیش نظر ہے۔ اس کو مرتّب کرنے میں کمیٹی کو تو اپنی سہولت پیش نظر تھی لیکن مجھے بھی اس سے کافی آسانی محسوس ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ تو ممکن نہ ہو گا کہ مَیں اپنے اظہارِ خیال میں بالکل سوال نامے کی ترتیب ہی ملحوظ رکھوں تاہم مَیں کوشش کروں گا کہ جتنا بھی ممکن ہو اسی ترتیب کے مطابق جواب دوں۔

اسرار احمد

۱۴؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء

* * *

تحریک جماعت اسلامی

کا

دورِ اوّل

اور اس کے
بنیادی افکار و نظریات

جماعت اسلامی کی باقاعدہ تشکیل تو اگرچہ ۱۹۴۱ء میں ہوئی لیکن جن نظریات و افکار پر اس کی بنیاد رکھی گئی' وہ اپنی جامع اور واضح شکل میں ان مضامین میں سامنے آئے جو ۳۹- ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے قلم سے نکل کر شائع ہوئے اور اب سیاسی کشمکش حصّہ سوم کی شکل میں طبع شدہ موجود ہیں۔ تشکیل پا جانے کے بعد جماعت نے ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک عملاً جس نہج پر کام کیا اس کی تفصیل رودادِ جماعت اسلامی حصص اوّل تا پنجم میں ملتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی خصوصیات معلوم کرنے کے لیے جماعت کے اسی لٹریچر کی طرف رجوع کرنا ہو گا!

ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے ------ تو ''تحریک جماعت اسلامی'' کے اس دور کی مندرجہ ذیل خصوصیات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

ظاہری اور حقیقی اسلام میں امتیاز

سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ کہ اس نے ''ظاہری اسلام'' اور ''حقیقی اسلام'' اور ''نسلی مسلمان'' اور ''اصلی مسلمان'' میں فرق اور امتیاز قائم کیا۔ اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام کو شعوری طور پر اختیار کرنے اور اصلی مسلمان بننے کی دعوت دی۔

مسلمان قوم کے نام سے اُس وقت جو لوگ پائے جاتے تھے (اور جیسے کہ آج کل کے بیشتر مسلمان ہیں) ان کا تجزیہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے اس طرح کیا:

''یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں' اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔

رشوت' چوری' زنا' جھوٹ اور دوسرے ذمائم اخلاق میں یہ کسی سے کم نہیں ہے...'' (مولانا مودودی: ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' حصّہ سوم)

''اِس وقت کے مسلمانوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کی اقسام بے شمار ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سانپوں کی قسمیں گن سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اقسام شمار نہیں کی جا سکتیں...''

(''دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات'' تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

پھر سمجھایا کہ:

''ظاہر ہے کہ مسلمان کی اتنی قسمیں نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان صرف ایک ہی قسم کا ہوسکتا ہے۔ اللہ اور اُس کی شریعت کا پابند' رسولؐ اور اس کی تعلیمات کا فرمانبردار۔''

(''دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات'' تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

''مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ ''اسم ذات'' نہیں بلکہ اسم صفت ہی ہو سکتا ہے اور ''پیرَو اسلام'' کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اس خاص ذہنی' اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام اسلام ہے...'' (''مسئلہ قومیت'' از مولانا مودودی)

یہودیوں اور نصرانیوں کے غلط مزعومات ----- جیسے ''سَیُغْفَرُ لَنَا''---- اور ''لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ''--- اور --- ''نَحْنُ اَبْنَاءُ اللہِ وَاَحِبَّاءُہٗ''کی طرح کے غلط اور گمراہ کن نظریات جو مسلمان قوم میں پھیل گئے تھے اور جن کے باعث ایمان بالآخرت لفظی اور لسانی اقرار کے باوجود عملاً بالکل غیر مؤثر ہو کر رہ گیا تھا' ان کا پُرزور اور مدلل ابطال کیا گیا ----- اور مسلمانوں کو خبردار کیا گیا کہ تم میں سے ایک ایک کا بے لاگ محاسبہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہونے والا ہے اور محض مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور ظاہری شکل و صورت بنا لینے سے وہاں چھٹکارا نہیں ملے گا بلکہ وہاں قلبی ایمان اور حقیقی اسلام ہی کام آسکے گا۔ مولانا مودودی کی کتاب ''خطبات'' کے ابتدائی خطبے جن میں یہ بات کھول کربیان کی گئی' اگرچہ اسی کلام اللہ کی ترجمانی تھے جسے ہمیشہ سے مسلمان پڑھتے اور پڑھاتے چلے آرہے تھے لیکن اس ماحول میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک بالکل نئی بات کہی جا رہی ہے۔ رودادِ جماعت اسلامی حصّہ سوم کا یہ اقتباس کتنا واضح ہے:

''عام طور پر لوگ فقہی اور قانونی اسلام اور اس حقیقی اسلام میں جو خدا کے ہاں معتبر ہے' فرق نہیں کرتے ----- فقہی اور قانونی اسلام میں آدمی کے قلب کا حال نہیں دیکھا جاتا اور نہیں دیکھا جا سکتا' بلکہ اس کے اقرارِ زبانی کو اور اس امر کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان لازمی علامات کو نمایاں کرتا ہے یا نہیں جو اقرارِ زبانی کی توثیق کے لیے ضروری ہیں۔ یہ چیز صرف دنیا کے لیے ہے اور دُنیوی حیثیت سے وہ قانونی اور تمدنی بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر مسلم سوسائٹی کی تعمیر کی کی گئی ہے ----- لیکن آخرت میں آدمی کی نجات اور اس کا مسلم و مؤمن قرار دیا جانا اور اللہ کے مقبول بندوں میں شمار ہونا اس قانونی اقرار پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہاں اصل چیز آدمی کا قلبی اقرار' اس کے دل کا جھکاؤ اور اس کا برضا و رغبت اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے حوالے کر دینا ہے۔ اللہ آدمی کے دل کو اور اس کے باطن کو دیکھتا ہے اور اس کے ایمان کو ناپتا ہے۔ اس کے ہاں آدمی کو جس حیثیت سے جانچا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا اس کا جینا اور مرنا' اس کی وفاداریاں اور اس کی اطاعت اور بندگی اور اس کا پورا کارنامۂ زندگی اللہ کے لیے ہے یا کسی اور کے لیے ----- اگر اللہ کے لیے ہے تو وہ مسلم و مومن ہے اور اگر کسی اور کے لیے ہے تو نہ مسلم ہے نہ مومن ! ! ...''

(''خطبۂ جمعہ مولانا مودودی'' روداد جماعت اسلامی' حصّہ سوم)

اس طرح قانونی اور حقیقی مسلمان کا فرق واضح کرنے کے بعد جماعت اسلامی نے اپنی دعوت ان الفاظ کے ساتھ پیش کی:

''... ۱۔ یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔''

۲۔ یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کو ماننے کا دعویٰ یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کر دے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے ! ! ...'' (دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ----- اور تحریک مجاہدین کے بعد مسلم ہندوستان میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ پہلی آواز تھی جس کے بلند کرنے کا شرف جماعت اسلامی کو حاصل ہوا۔ جماعت سے قبل اور اس کی تشکیل کے وقت جو دوسری کوششیں اسلام پسند حلقوں کی طرف

سے ہو رہی تھیں وہ زیادہ تر دو طرح کی تھیں۔ ایک مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے قومی تشخص کے تحفظ اور ان کے دنیوی مفاد و فوز و فلاح کی کوششیں ---- اور دوسرے جدید مغربی فلسفہ و سائنس اور افکار و نظریات کے مقابلے میں اسلامی نظریات و افکار و عقائد کے لیے علمی و عقلی استدلال بہم پہنچانے کی کوششیں جن سے جدید علم الکلام معرض وجود میں آیا۔ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بننے اور جس دین کے وہ دعویدار ہیں اس کے فی الواقع متبع اور پیرو بننے کی زور دار دعوت ایک طویل عرصے کے بعد صرف جماعت اسلامی اور اس کے اکابرین کی طرف سے سننے میں آئی---- اور یہ جماعت اسلامی کی وہ پہلی اور بنیادی خصوصیت ہے جو اسے دوسری تمام ''مسلمان تحریکوں'' سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔

غیر مسلموں سے خطاب

''تحریک جماعت اسلامی'' کی دوسری اہم اور بنیادی خصوصیت جو اسے دوسری تمام ہم عصر تحریکوں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ --- اس نے اپنی دعوت اور اپیل کو مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر مسلموں تک عام کر دیا۔ وہ دعوتِ بندگی رب (یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ) کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی اور اس دعوت کو اُس نے اپنوں اور بیگانوں، غیر مسلموں اور مسلمانوں سب کے سامنے پیش کیا ---- اوپر ''دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات'' کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے اس کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں:

''ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔''

حادثہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان کے لوگوں کو ہوش آنا شروع ہوا اور انگریزی اقتدار کو ایک مسلمہ حقیقت مان کر ہندوستانیوں نے جب اس کے تحت زندگی گزارنے کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا تو فوراً ہی ایک مسئلہ جو بوجوہ پیدا ہو گیا وہ ہندوئوں اور مسلمانوں کی آپس کی مسابقت کا مسئلہ تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ انتہائی کسمپرسی، انتشار اور مایوسی کا وقت تھا۔ تاریخ کی ایک ہی کروٹ نے انہیں مسندِ حکومت

سے گرا کر اپنی سابق محکوم قوم کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔ ان پر اس سانحے کے صدمے کی وجہ سے ایک مدّت تک سکتے کی سی کیفیت طاری رہی اور وہ ابھی اسی کیفیت میں گرفتار تھے کہ ہندو جن کے لیے حاکموں کی تبدیلی کا یہ واقعہ اتنا عظیم سانحہ نہ تھا، فوراً نئے حالات کے ساتھ موافقت کی کوشش میں لگ گئے اور ''تنازع للبقا'' کی دوڑ میں مسلمانوں

سے کہیں آگے نکل گئے۔ مسلمانوں کو ہوش آیا اور انہوں نے حالات کا جائزہ لیا تو اس کے سوا انہیں اور کوئی راہ نہ سوجھی کہ ایک طرف اپنی قومی روایات' اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے قومی تشخص کا تحفظ کریں اور دوسری طرف انگریزی اقتدار کے تحت سرکاری ملازمتوں اور ملک کے دوسرے کاموں میں اپنا' بلحاظ تناسب آبادی' جائز حصّہ وصول کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی اس وقت مسلمانانِ ہند کا قومی نصب العین قرار پایا اور اس طرح ہندوئوں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے ساتھ تصادم کی کیفیت رونما ہوئی۔ ابتداءً یہ تصادم صرف سرکاری ملازمتوں اور دوسری سہولتوں کے حصول تک محدود تھا' لیکن ایک عرصے کے بعد جب ہندوستانیوں میں اپنے حق خود ارادیت کا احساس پیدا ہوا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدّوجُہد شروع ہوئی تو یہ تصادم مزید وسیع اور نمایاں ہو گیا اور مسلمانوں کا قومی نصب العین یہ قرار پایا کہ ''ملنے والی آزادی'' میں سے اپنا حصّہ اس طرح وصول کیا جائے کہ مسلمان قوم کسی بڑی قومیت میں ضم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اسے اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

ان حالات میں مسلمانوں کی کسی جماعت کا اپنی دعوت اور اپنی اپیل کو مسلمانوں سے بڑھ کر غیر مسلموں تک عام کرنا بے حد کٹھن تھا۔ لیکن جماعت اسلامی نے یہ طریق کار اختیار کیا ----- اور اگرچہ اس میں جماعت اسلامی کو متعدد وجوہ کی بنا پر' جن میں سب سے زیادہ اہم ''مسلمان قومیت'' کا صدیوں پرانا تصوّر اور اس میں حالیہ قومی کشمکش کی پیدا کردہ شدّت اور تلخی تھی' کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی' لیکن ''تحریک جماعت اسلامی'' کی تاریخ مرتّب کرنے والا ہر شخص جماعت اسلامی کی اس خصوصیت کو اس کے خصائص میں نمایاں جگہ دے گا۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ جماعت اسلامی نے بڑے زور کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے یہ بات پیش کی کہ ''اتمام حُجّت'' سے قبل ''تکفیر'' جائز نہیں ہے۔ کافر تو وہ ہوتا ہے کہ جس پر حق کی دعوت کو واضح کر کے اتمامِ حُجّت کیا جا چکا ہو اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ آج کے غیر مسلموں کے سامنے آخر اسلام پیش ہی کب کیا گیا کہ ان کے انکار کا سوال پیدا ہو۔ انہوں نے تو اسلام کو صرف اپنی مدّ مقابل قوم کے مذہب کی حیثیت سے جانا ہے' ایک اصولی دعوت اور انسانیت کے لیے ایک پیغام کی حیثیت سے تو ان کے سامنے اسے سرے سے پیش ہی نہیں کیا گیا کہ ان کے اسے رد کرنے کا سوال پیدا ہو۔ لہٰذا انہیں گمراہ اور ضال ---- اور قانونی حیثیت سے کافر بھی ضرور سمجھا جائے لیکن حقیقی اور معنوی اعتبار سے انہیں کافر قرار دے کر ان سے براءت اور علیحدگی اختیار کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ خود قانونی اور فقہی اسلام سے آگے بڑھ کر حقیقی اور اصلی اسلام اختیار کرو اور غیر مسلموں کو ان کے قانونی کفر کے باوجود گمراہ اور حقیقت اور دین حق کے واضح نہ ہونے کے باعث بھٹکا ہوا سمجھ کر پوری دل سوزی اور حقیقی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کے ساتھ اسلام کی

طرف بلائو۔

اسی مفہوم پر مشتمل مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا کوئی مضمون اخبار ''کوثر'' لاہور میں شائع ہوا تھا‘جس پر کسی صاحب نے ناک بھوں چڑھا کر اعتراض وارد کیا‘جس کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی ہی کے قلم سے ''ترجمان القرآن'' ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے یہ الفاظ قابلِ توجّہ ہیں:

''آپ کا یہ معارضہ کہ اس مضمون سے ثابت ہو رہا ہے کہ اب جب کہ تبلیغ اور صحیح طریقے سے اتمامِ حُجّت نہیں ہو رہا ہے تو ہم موجودہ حالات میں ہندو‘انگریز‘سکھ اور پارسی وغیرہ قوموں کو بھی کافر نہ سمجھیں‘نہ کافر قرار دے کر ان سے بیزاری کریں‘عجیب و غریب ہے۔ یہ تو بہر حال واقعہ ہے جس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آج تبلیغ اور اتمامِ حُجّت نہیں ہو رہا ہے اور یہ بھی از روئے شرع مسلّم ہے کہ بغیر اتمامِ حُجّت تکفیر اور اعلانِ براء ت جائز نہیں۔ اب اگر آپ اپنے موجودہ رویے ہی

کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں تو یا تو یہ ثابت کیجیے کہ آج تبلیغ اور اتمامِ حُجّت کے تمام ضروری وسائل برسر کار ہیں۔ یا یہ ثابت کیجیے کہ بغیر تبلیغ اور اتمامِ حُجّت کے بھی تکفیر اور اعلانِ براء ت درست ہے‘لیکن جب آپ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں کر رہے ہیں تو ہم سے یہ مطالبہ کیوں کر رہے ہیں کہ ہم ایک حقیقت کے اظہار سے اس لیے رک جائیں کہ اس سے آپ کے ایک غلط مزعومے کی غلطی ثابت ہو رہی ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ بجائے اس کے کہ اپنی غلطی کو درست کرنے کے لیے ہماری صحیح بات کو غلط کرنے کی کوشش کریں اپنے ہی رویے کو درست کر لیں اور ساری دنیا کی تکفیر اور اعلانِ براء ت سے پہلے اس فرضِ تبلیغ و شہادت علی الناس کی ذمہ داری ادا کریں جو اُمّتِ مسلمہ پر واجب ہے۔''(۱۴)

(''ترجمان القرآن'' ج ۲۹‘ص ۲۵۰)

ایک اصولی اسلامی جماعت

متذکرہ صدر دو خصوصیات کی بناء پر جماعت اسلامی ''مسلمانوں کی ایک قومی جماعت'' بننے کے بجائے ایک ''اصولی اسلامی جماعت'' بنی‘جس کا مقصد وحید اسلام کی

---

(۱۴) اس ضمن میں‘اس حقیقت کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفیائے اسلام کے طریق تبلیغ میں ایک اہم نکتہ یہی تھا کہ وہ قانونی کفر و اسلام کے بجائے حقیقی ایمان پر نگاہ مرکوز رکھتے تھے اور اپنے پاس آنے جانے والے غیر مسلموں کو زیادہ بُعد کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے‘بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی اللہ والے کی خدمت میں کوئی غیر مسلم آتا جاتا رہا اور رفتہ رفتہ اس کے دل میں حقائق ایمانی

جاگزیں ہوتے چلے گئے جس کا اسے احساس تک نہ ہوا ... تا آنکہ کسی وقت کلمہ شہادت کی ادائیگی اور نام اور شکل و ہیئت کی تبدیلی بھی بالکل ایسے ہوگئی جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں جی چاہتا ہے کہ ''الغزالی'' مصنفہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا یہ اقتباس بھی پیش کیا جائے: ''ان کی (امام غزالیؒ کی) رائے میں بجز ان کُفّار کے جن کے سامنے اسلام کی حقیقت پورے طور پر ظاہر کر دی جائے اور پھر وہ ایمان نہ لائیں باقی سب مجبور و معذور ہیں۔ چنانچہ رسالہ ''تفرقہ'' میں لکھتے ہیں: بل اقول اکثر النصاریٰ والترک فی ھذا الزمان تشملھم الرحمۃ ان شاء اللہ (بلکہ میں کہتا ہوں کہ اکثر نصاریٰ روم اور ترک جو ہمارے زمانہ میں ہیں ان کو رحمت الٰہی ان شاء اللہ شامل ہوگی)۔''

سربلندی اور اس کا بول بالا کرنا تھا اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ اسلام اس ''قوم'' کا ''مذہب'' تھا کہ جس کا وہ بھی ایک جزو تھی، بلکہ اس لیے کہ اس کی نگاہ میں وہی ''حق'' تھا اور اسی میں پوری نوعِ انسانی کی دنیوی اور اُخروی فلاح تھی۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات کو پس منظر میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات اُس وقت لوگوں کو کس قدر انوکھی محسوس ہوئی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ''مسلم قومیت'' کا جذبہ روز بروز شدت پکڑتا جا رہا تھا اور مسلمانانِ ہند کا قومی نصب العین یہ قرار پا چکا تھا کہ جب تک انگریز موجود ہے اس کے ماتحت رہتے ہوئے ان تمام حقوق و رعایات سے اپنی تعداد کے تناسب سے حصّہ حاصل کیا جائے جو وہ محکوم ہندوستانیوں کو دیں۔ اور جب ہندوستان آزاد ہو تو اس آزادی سے مسلمان اس طرح متمتع ہوں کہ انہیں اپنے قومی تشخص کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلسل تصادم اور کشمکش کے باعث یہ ''مسلم قوم پرستی'' جس تیزی کے ساتھ مسلمانوں کے ذہنوں میں سرایت کر رہی تھی اور اس کی جڑیں جس سرعت کے ساتھ مضبوط ہو رہی تھیں اس کا اندازہ ''سیاسی کشمکش' حصّہ سوم'' کے دیباچہ کے حسبِ ذیل الفاظ سے ہو سکتا ہے:

''اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدّت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزو اتنا کم اور قوم پرستانہ جزو اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں...''

''مسلم قومیت'' اور ''مسلمان قوم پرستی'' کے اس گمراہ کن تصور اور نظریے کے خلاف جماعت اسلامی نے عَلم جہاد بلند کیا، خود ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے سرگرم کار ہوئی اور مسلمانوں پر واضح کیا کہ

تم نے ایک بالکل غلط پوزیشن اختیار کر لی ہے‘ تم باصطلاحِ معروف ایک ''قوم'' بن کر رہ گئے ہو حالانکہ تمہارا مقام ایک اصولی جماعت

56

(Ideological Party) کا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات: (از ''مسئلہ قومیت'' مصنفہ مولانا مودودی)

''قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا ہے وہ ''حزب'' ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔''

... ''دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنوں میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ ''اُمّت'' ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ اُمّت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کر دیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے اُمّت کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی اُمّت کہے جاتے ہیں‘ ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی اُمّت کہے جاتے ہیں ۔ مسلمانوں کو جس اصل مشترک کی بناء پر اُمّت کہا گیا ہے‘ وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ ---- اور وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ --- ان آیات پر غور کیجیے۔ ''بیچ کی اُمّت'' سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت (Inernational Party) کا نام ہے۔''

...

57

''تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ ''جماعت'' ہے اور یہ لفظ بھی حزب کی طرح بالکل پارٹی کے ہم معنی ہے۔ ''عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ'' اور ''يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ'' اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لفظ قوم یا شعب یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے جماعت ہی کی اصطلاح استعمال کی... اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر

58

حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت

قوم پرستانہ نصب العین کو چھوڑ کر جماعت اسلامی نے جو نصب العین اختیار کیا اور جسے قبول اور اختیار کرنے کی دعوت اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی وہ ''حکومتِ الٰہیہ'' کا قیام ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ تشکیل جماعت کے وقت مسلمانانِ ہندوستان کی قومی جدّوجُہد دو چیزوں پر مرکوز تھی۔ اوّلاً ---- دورِ محکومی میں حکمران قوم کی طرف سے عطا کردہ حقوق و رعایات میں سے بلحاظ تناسب آبادی اپنے جائز حصے کا حصول اور ثانیاً-- بصورتِ آزادی اپنے قومی تشخص کے تحفظ کی ضمانت۔ ۱۹۴۱ء - ۱۹۴۰ء کے آس پاس جب کہ جماعت اسلامی قائم ہوئی' مؤخر الذکر شق میں مسلمانانِ ہند کی نگاہیں ''حصولِ پاکستان'' کے نصب العین پر جم گئی تھیں' عین اس وقت جماعت اسلامی نے ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے قیام حکومت اِلٰہیہ کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے رکھا۔

''سیاسی کشمکش' حصّہ سوم'' کے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کی تشکیل کی دعوت ان الفاظ میں دی:

''جو کچھ عرض کیا جا چکا ہے اس سے تین حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بنیادی طور پر بدل دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ کلی اور اساسی تغیر صرف اس طریق پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔ تیسرے یہ کہ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے اور نہ اس طریق پر ہے۔

اس توضیح کے بعد بلا کسی تمہید کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو حقیقی معنوں میں ''جماعت اسلامی'' ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریق پر کام کرے...''

اور پھر جماعت کی تشکیل کے بعد جماعت اسلامی کا جو دستور مرتّب ہوا اس میں عقیدہ کی تشریح کے بعد اس کا ''نصب العین'' واضح طور پر ان الفاظ میں ثبت ہوا:

''دفعہ ۲۔ جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جُہد کا مقصود دنیا میں

حکومتِ الٰہیہ اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔''

''نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں'' نامی مضمون میں مولانا مودودی صاحب نے ''قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ'' کے دعوے کے ساتھ قوم پرستانہ نصب العین اور اس کے حصول کے لیے لائحۂ عمل اور صحیح اسلامی نصب العین اور اس کے حصول کے طریق کار کے فرق کو وضاحت کے ساتھ پیش فرما دیا تھا۔ کتنا حقیقت پسندانہ

جائزہ ہے !

''اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے' اس کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں... !''

پھر قوم پرستانہ طریق کار کی تشریح ملاحظہ ہو:

''ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظامِ معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں اور ان کی تمام جدّوجُہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے' قطع نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام سے یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو !''

لیکن ساتھ ہی متنبہ کر دیا گیا کہ:

''مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ کسی نسلی گروہ سے کوئی دلچسپی ہے' نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات و رسوم سے کوئی لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقا کے میدان میں اتریں اور انتخابِ طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے !''

دوسری راہ ----- ! !

''لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام یہودیت اور ہندو ازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قوم بناتا ہے بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے ---- وہ ایک جہانی نظریہ(World Theory) اور ایک عالمی تصور(Universal Idea) ہے !''

اور اگر اسے قبول کرنا ہے تو -----

''آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرفِ نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جما

دینی ہو گی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمران ہیں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا ہو گا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو‘آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑے گا۔ ان ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہو گا جو آپ کے اصولوں کو نہ مانتے ہوں اور سب قوموں میں سے ان صالحین کو چُن چُن کر اپنے ساتھ ملانا ہو گا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی پڑے گی۔ اپنے اصول سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکیں گے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑے گا جو اپنے اصول کے لیے لڑنے والی ہو‘جس کا مقصد اپنی قومی حکومت (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے اصولوں کی حکومت (Ideological State) قائم کرنا ہو... ! ! ‘‘

منہاج الانقلاب الاسلامی

اپنے پیش نظر کام --- یعنی حکومتِ الٰہیہ کے قیام --- کے لیے جماعت اسلامی نے اس کی مناسبت سے ایک پروگرام تجویز کیا جو اس کے دعویٰ کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کے طریق کار سے اخذ شدہ تھا اور پھر پوری شدّت کے ساتھ یہ بات مسلمانوں کے سامنے رکھی کہ حکومتِ الٰہیہ اور اسلامی حکومت تو محض اس ایک ہی طریق سے قائم ہو سکتی ہے۔ تم

اگر چاہو حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی نظام حکومت کی تشکیل لیکن طریق کار کوئی اور اختیار کرو تو یہ ایک احمقانہ فعل ہو گا اور اس طریق پر سعی وجُہد سے اسلامی ریاست ہرگز قائم نہ کی جا سکے گی۔ ’’اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟‘‘ نامی مضمون میں جو مولانا مودودی صاحب نے غالباً ۱۹۴۰ء میں تحریر فرمایا تھا‘اس مسئلے کی پوری وضاحت ملتی ہے۔

’’نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء‘‘ کے عنوان سے مولانا لکھتے ہیں:

’’حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو‘مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی‘نفسیاتی‘تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Pre-requisites)‘ کچھ اجتماعی محرکات‘کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں‘جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے یہ وجود میں آتی ہے۔‘‘

آگے چل کر اسی کی مزید وضاحت ملتی ہے:

’’جس نوعیت کا بھی نظام حکومت پیدا کرنا مقصود ہو اسی کے مزاج اور اسی کی فطرت کے مناسب

اسباب فراہم کرنا اور اسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہر حال ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے‘اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں‘اسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے‘اسی طرز کے کارکن تربیت کیے جائیں‘اسی ڈھنگ کی لیڈر شپ ہو اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرتاً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدّت تک جدّوجُہد سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقتور اسباب نے جدّوجُہد کی ہوتی ہے۔‘‘

اس کے بعد ’’اسلامی حکومت‘‘ کی دو بنیادی خصوصیات----- یعنی پہلی یہ کہ یہ ایک اصولی حکومت (Ideological State) ہے اور دوسری یہ کہ اس کی پوری عمارت خدا کی

حاکمیت کے تصوّر پر قائم کی گئی ہے-----بیان کرنے کے بعد مولانا اس کے قیام کے فطری اور واحد طریق کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

’’در حقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات‘وہ مقصد زندگی‘وہ معیارِ اخلاق‘وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدّوجُہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام لے کر اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ‘مسلم فلسفی‘مسلم مؤرخ‘ مسلم ماہرین مالیات و معاشیات‘مسلم ماہرین قانون‘مسلم ماہرین سیاست غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں۔ جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کریں اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے خدا ناشناس ائمہ فکر کے مقابلے میں اپنی عقلی و ذہنی قیادت (Intellectual Leadrship) کا سکہ جما دیں۔ اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدّوجُہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدّوجُہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اُٹھا کر‘سختیاں جھیل کر‘قربانیاں کر کے‘مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ واقعی ایسے بے لوث‘بے غرض‘راست باز‘پاک سیرت‘ایثار پیشہ‘با

اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دیتے ہیں اس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہو گا۔ اس طرح کی جدّوجُہد سے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ راستی و نیکی موجود ہے، اس تحریک میں کھنچ آئیں گے۔ پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ

میں دبتے چلے جائیں گے۔ عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو گا۔ اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی اور طرز کے نظام کے لیے چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی حکومت قائم ہو جائے گی جس کے لیے اس طرز پر زمین تیار کی گئی ہو۔'' (ایضاً)

ان الفاظ میں مولانا مودودی صاحب نے ''مثبت'' طور پر ''منہاج الانقلاب الاسلامی'' کی تشریح کی اور اس میں دو باتوں کو بالکل واضح طور پر بیان فرمایا۔ ایک یہ کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ہمہ گیر تحریک اٹھے جو پورے معاشرے میں اسلامی نظریات کے مطابق ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی انقلاب برپا کر دے۔ دوسرے یہ کہ نظامِ حکومت میں فطری تبدیلی اسی وقت متوقع ہو سکتی ہے جب کہ ''عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہو جائے، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی اور طرز کے نظام کے لیے چلنا دشوار ہو جائے۔''

''منہاج الانقلاب الاسلامی'' کی اس ''مثبت تشریح'' کے ساتھ ساتھ ایک نظر اس ''منفی تعریض'' پر بھی ڈال لی جائے جو اُس وقت مسلمانوں کی قومی تحریک اور ان کے قومی نصب العین اور اس کے لیے اختیار کردہ طریق کار سے کی گئی تو آئندہ کے مباحث میں بہت آسانی پیدا ہو جائے گی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانانِ ہند تقریباً متفق ہو کر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر نظریۂ پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کی تحریک اگرچہ ایک خالص قومی تحریک تھی اور محض قوم پرستی کے جذبہ کے تحت چل رہی تھی لیکن اس میں اصطلاحات تمام کی تمام اسلام سے مستعار لی گئی تھیں اور نظریۂ پاکستان کو اسلامی حکومت کے قیام کے جذبہ سے متصف بیان کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس شور و شغب میں اسلامی حکومت اور حکومتِ الٰہیہ کے مقدّس الفاظ کو بے جانے بوجھے بکثرت استعمال کیا جا رہا تھا۔

خود مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں:

''اس خام خیالی (Lose Thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی

ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے‘جس کا نام ’’اسلامی حکومت‘‘ ہو مگر خالص علمی (scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیونکر قائم ہوا کرتی ہے۔‘‘

اس کے بعد ’’خام خیالیاں‘‘ کا باقاعدہ عنوان قائم کر کے مولانا موصوف نے اسلامی حکومت اور اس کے قیام کے لیے طریق کار کے سلسلے میں جو بھانت بھانت کی بولیاں اُس وقت بولی جا رہی تھیں ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے:

’’بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی‘ مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ‘ سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے‘ اس کی بنا پر میں اس کو نا ممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں‘ حکومت کا نظامِ اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو‘ کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرماں روا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی‘ اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دین داری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں‘ صرف اس کی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا‘ اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔

ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے‘ اگر وہ صحیح اسلامی کیرکٹر کے عاشق نہیں ہیں‘ اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی ’’مسلمان‘‘ قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے‘ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر کیونکہ وہ ’’قومی حکومت‘‘

جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا' اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم ''قومی حکومت'' ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی ''قومی حکومت'' کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہو گا تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل اختیار کیوں نہ کریں' اس نام نہاد ''قومی حکومت'' کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہو گی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدراہ ثابت ہو گی۔''

اسی سے ملتا جلتا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات اس دلیل کے جواب میں کہی گئی تھی کہ مسلمانوں کی ایک قومی حکومت (پاکستان) کے قیام سے حکومت الٰہیہ کا اصل مقصد حاصل نہ بھی ہو تو کم از کم اس نصب العین کی طرف پیش قدمی اور اس کے لیے سعی وجُہد آسان تو ہو جائے گی --- - کہا گیا کہ:

''اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے' ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل

کر کے اور ان کی نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی نظام میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ثابت ہو گی؟ کیا وہ لوگ جو بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا روپیہ اور اس کے وسائل اور اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا' بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کی بجائے الٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کی نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں' اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کا مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔''

نبی اکرم ﷺ کے طریق کار سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی

اگرچہ بہت سے ''ملکی'' اور ''قومی'' مسائل موجود تھے لیکن آپؐ نے ان کے حل میں اپنے وقت کو صرف کرنے کی بجائے براہ راست اپنے اصل نصب العین کی طرف اس کے مخصوص طریق کار پر پیش قدمی شروع فرما دی:

''رسول اللہ ﷺ جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی ‘تمدنی ‘معاشی اور سیاسی معاملات حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع بھی ہوتا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپؐ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل تھے جو ایک لیڈر کے ناخن تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت ‘اخلاقی پستی ‘افلاس ‘طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی

تسلط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنے سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اسی سے ایک گونہ سیاسی و معاشی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز میں نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کی طرف بھی توجہ نہ کی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ خدا کے سوا تمام اِلہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کر لو۔''

اس اقتباس سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی نگاہ میں ۴۱- ۱۹۴۰ء کی ہندوستانی مسلم قوم پرستی اور اس کے مسائل اپنی اصل کے اعتبار سے مشرکینِ مکّہ کی قوم پرستی اور اس کے مسائل سے کسی طرح بھی مختلف نہ تھے!

مزید توضیح کے لیے دو اور اقتباسات:۔

۱۔ تقریر مولانا نصر اللہ خاں عزیز: ۲۵؍ اپریل ۱۹۴۷ء بمقام پٹنہ

''اگر آپ فی الواقع نظامِ اسلامی کے قیام کے خواہاں ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اور اپنے لوگوں کے دلوں کو بدلیے۔ وہ دل ان جسموں کو بدلیں گے جن میں وہ دھڑک رہے ہوں گی۔ پھر وہ اجسام اپنے گھروں اور خاندانوں اور بستیوں اور شہروں کو بدلیں گے جن میں وہ رہتے ہوں گے۔ ان کی سیرتیں ‘ان کی صورتیں ‘ان کے معاملات ‘تعلقات ‘سیاست ‘تجارت ‘معاشرت اور تمدن ہر شے بدلتی جائے گی تاآنکہ وہ ایک ایسی سوسائٹی اور جماعت بن جائیں گے کہ ان کے اندر کسی دوسرے نظریۂ زندگی کا عملاً چلنا محال اور نا ممکن ہو جائے گا اور وہ نظامِ

اسلامی وجود میں آئے گا جس کی ہر چیز اسلامی اور ہر جز سر تا پا اسلام ہو گا۔ اسلامی نظام ہمیشہ اسی طریق پر قائم ہوا ہے اور آئندہ جب کبھی قائم ہو گا' اسی طرح ہو گا۔ جو لوگ اس کے سوا کسی دوسرے طریقے کو بھی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں اور ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اس دھوکے کو جلد از

جلد دور کر دیں۔'' (''روداد جماعت اسلامی'' حصّہ پنجم)

۲۔ تقریر طفیل محمد صاحب 'قیم جماعت: اپریل ۱۹۴۶ء بمقام الٰہ آباد

''علمائے اسلام ہر چوراہے پر خدا کے دین کی بجائے وطنیت یا قومیت کی دعوت لیے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے مشائخ ان قیادتوں کی قبولیت کو واحد ذریعۂ نجات اور معیارِ کفر و اسلام قرار دے رہے ہیں جن میں ہر ملحد و دہریہ منکر خدا اور رسول صرف عبد اللہ و عبد الرحمٰن نام بتا کر داخل ہو سکتا ہے۔''

(''روداد جماعت اسلامی'' حصّہ چہارم)

ستمبر' اکتوبر ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن میں ''موجودہ سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک'' کے عنوان سے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

''آپ نے جو سوال ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے متعلق یہ دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اوّل یہ کہ ہماری جماعت کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول بھی چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اُخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے' اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوئوں سمیت ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو

اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔''

اپنے نصب العین اور اس کے حصول کے مخصوص طریق کار کے سوا دنیا کے دوسرے تمام مسائل سے جماعت اسلامی کی عدم دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اس ملک سے باہر دنیا میں مسلمانوں کے دوسرے قومی مسائل سے بھی اس نے قطعی صرفِ نظر کیا۔ قضیۂ فلسطین کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے ''ترجمان القرآن'' ستمبر ۱۹۴۶ء میں فرمایا:

''ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکہ سخت ظلم کر رہے ہیں۔ فلسطین کے معاملہ میں انہوں نے بے انصافی کی حد کر دی ہے ... لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین، یا ہندوستان یا ایران یا ٹرکی کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کشمکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اس مسئلہ پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا دوسرے مسائل کے حل ہوجانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

پھر خود ان تمام مسائل کے بارے میں جماعت اسلامی نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ سرے سے کوئی مسائل ہیں ہی نہیں بلکہ صرف ''اس غفلت کے شاخسانے'' ہیں جو مسلمانوں نے اپنے اصل کام یعنی شہادتِ حق ---- اور ---- اقامت دین سے برتی ہے۔ اور ان کا حل بھی ان میں سے ایک ایک کے حل کی سعی کرنے سے نہ ہوگا بلکہ صرف اس طرح ہوگا کہ مسلمان اپنا اصل کام سر انجام دیں:

''حضرات جو کچھ مَیں نے عرض کیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں اور یہ کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا خمیازہ کیا بھگت رہے ہیں۔ اس پہلو سے اگر آپ حقیقت

معاملہ پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ بات خود ہی آپ پر کھل جائے گی کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں جن مسائل کو اپنی قومی زندگی کے اصل مسائل سمجھ رکھا ہے اور جنہیں حل کرنے کے لیے وہ کچھ اپنے ذہن سے گھڑی ہوئی اور زیادہ تر دوسروں سے سیکھی ہوئی تدبیروں پر اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، فی الواقع ان میں سے کوئی بھی ان کا اصل مسئلہ نہیں ہے اور اس کے حل کی تدبیر میں وقت، قوت اور مال کا یہ سارا صرفہ محض ایک زیاں کاری ہے۔ یہ سوالات کہ ایک اقلیت ... اور ایسے ہی دوسرے مسائل غیر مسلموں کے لیے تو ضرور اہم

ترین اور مقدّم ترین مسائل ہو سکتے ہیں اور ان کی تمام توجہات اور کوششوں کے مرکز و محور بھی قرار پا سکتے ہیں‘ مگر ہم مسلمانوں کے لیے یہ بجائے خود مستقل مسائل نہیں ہیں بلکہ محض اس غفلت کے شاخسانے ہیں جو ہم اپنے اصل کام سے برتتے رہے ہیں۔ اگر ہم نے وہ کام کیا ہوتا تو آج اتنے بہت سے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل کا یہ جنگل ہمارے لیے پیدا ہی نہ ہوتا اور اگر اب بھی ہم اس جنگل کو کاٹنے میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی بجائے اس کام پر اپنی ساری توجہ اور سعی مبذول کر دیں تو دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے پریشان کن مسائل کا یہ جنگل خود بخود صاف ہو جائے گا کیونکہ دنیا کی صفائی اور اصلاح کے ذمہ دار ہم تھے۔ ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا تو دنیا خار دار جنگلوں سے بھر گئی اور ان کا سب سے زیادہ پُر خار حصّہ ہمارے نصیب میں لکھا گیا ...‘‘ (’’شہادتِ حق‘‘: مولانا مودودی)

اقتباسات کا یہ سلسلہ طویل ہو رہا ہے لیکن ’’دورِ اوّل‘‘ کی جماعت اسلامی کی تصویر کشی کے لیے ان اقتباسات کا نقل کرنا ناگزیر تھا۔ اس سلسلے میں آخری اقتباس جماعت اسلامی کے اجتماع ٹونک منعقدہ ۱۷-۱۸ ر اپریل ۱۹۴۷ء کے موقع پر ’’دو سوال اور ان کا جواب‘‘ ہے۔ اس جواب نے اس مسئلے کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

’’سوالات: ۱۔ یہ تسلیم ہے کہ مسلم لیگ کے پیش نظر جو پروگرام ہے وہ غیر اسلامی ہے لیکن اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے نا واقف ہے۔ علماء نے

انہیں اسلام سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی‘ وہ اپنے سیاسی لیڈروں کے بتلائے ہوئے راستے کو ہی صراطِ مستقیم اور اسلام کا صحیح راستہ سمجھ رہے ہیں اور غیر مسلم قومیں ان کے وجود کو مٹانے کے لیے سفاکی و خوں ریزی سے کام لے رہی ہیں۔ ان حالات میں ان کی مظلومی میں جماعت ان کا ساتھ کیوں نہ دے اور غیر مسلموں سے اس مدافعانہ جنگ میں شریک کیوں نہ ہوں؟

۲۔ اس وقت برطانیہ‘ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوئوں کا حصّہ ہندوئوں کے حوالے کیا جائے اور مسلمانوں کا حصّہ مسلمانوں کے حوالے کیا جائے اور دوسری یہ کہ پورے ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوئوں کے حوالے کر دی جائے۔ ظاہر ہے اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک پر اور مسلمانوں پر مسلّط ہو جائے گی۔

جواب از امیر جماعت: ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے‘ کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قسم کے حالات

دیکھ کر وہ ہم سے اس وقت یہ مطالبہ کر رہے ہیں' ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور ہر مسئلہ پہلے مسئلے سے شدید تر ہو گا اور آپ کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک رُخ۔ دوسرا رخ جو اس سے کہیں زیادہ قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے' یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے

میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں' لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہوری حکومت (Secular Democratic State) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (Popular Parliamentary Govt.) نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنت کے اصولوں پر قائم ہو سکتی ہے۔

اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشات نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کی بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے کام کو چھوڑیئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصّہ لیجیے۔'' (روداد جماعت اسلامی)

خلاصۂ مباحث

اس بحث کو ختم کرنے سے قبل مَیں چاہتا ہوں کہ اس کا ایک خلاصہ بھی نکال کر سامنے رکھ دوں تاکہ آئندہ کے مباحث میں ان طویل اقتباسات کے نتائج کو بآسانی ذہن میں مستحضر رکھا جا سکے۔ اس پوری بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

* اوّل یہ کہ اسلامی نظام حکومت اور حکومت ِالٰہیہ کسی معاشرے میں اوپر سے لا کر جڑ دینے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے معاشرے میں اسلامی افکار و نظریات اور اس کے اصولوں کے مطابق ایک ہمہ گیر ذہنی و فکری اور عملی و اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ جب یہ انقلاب معاشرے میں اس درجہ جڑ پکڑ جاتا ہے کہ کسی اور نظام حکومت کا اس کے اوپر مسلط رہنا نا ممکن ہو جائے تو آپ سے آپ ایک فطری طریقے پر نظام حکومت میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

* دوم یہ کہ مسلمانوں نے (ہندوستان میں بھی اور بیرون ہند بھی) جن مسائل کو اپنے قومی مسائل سمجھ رکھا ہے:

۱۔ وہ سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے اگر مسلمان اپنا اصل کام یعنی شہادتِ حق اور

اقامت ِدین سرانجام دیتے رہتے۔ یہ مسائل اس اصل مسئلے سے مسلمانوں کی غفلت کا شاخسانہ ہیں!

۲۔ اور ان کے حل کے لیے ایک قومی طرز کی تحریک چلانا:

(ا): نہ اصولاً صحیح ہے' اس لیے کہ قوم پرستی سراسر غیر اسلامی اور خلافِ دین چیز ہے!

(ب): اور نہ مفید مطلب' اس لیے کہ اس طرح اصل بنائے فساد کے باقی رہنے کے سبب سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے اور مسائل کے اس جنگل کا اگر ایک گوشہ صاف ہوا تو دوسرا گنجان ہو جائے گا اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

۳۔ ان کے حل کی صرف ایک صورت اصولاً صحیح اور نتائج کے لحاظ سے متوقع طور پر بار آور ہے کہ مسلمان ہر طرف سے صرفِ نظر کر کے اپنا اصل کام یعنی شہادتِ حق اور اقامت ِدین کی سعی و جُہد شروع کریں اور اس میں ہمہ تن مصروف ہوجائیں۔

* سوم یہ کہ تحریک مسلم لیگ ----- اور نظریۂ پاکستان:

۱۔ سراسر غیر اسلامی تصوّرات ہیں' اس لیے کہ مسلم لیگ کی تحریک ایک قوم پرست تحریک ہے اور اس کے تحت اگر پاکستان حاصل کر بھی لیا گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ ایک قومی ریاست (National State) تو بن جائے گا لیکن اسلامی ریاست ہرگز نہ ہو گا۔

۲۔ پاکستان کی قومی حکومت کسی طرح بھی قیام نظام اسلامی (اقامت ِدین) میں ممد و معاون نہ ہو گی بلکہ غیر مسلمانوں کی قومی حکومت کے مقابلے میں مسلمانوں کی یہ قومی حکومت اس کام کے راستے میں کچھ زیادہ ہی رکاوٹ ثابت ہو گی۔

اور -----

۳۔ اگر پاکستان قائم ہو گیا تب بھی ہمیں نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اسی فطری طریق کار پر کام کرنا ہو گا کہ پہلے معاشرے میں ایک بنیادی تبدیلی برپا کریں اور اس کے بعد نظامِ حکومت میں تبدیلی کی توقع کریں۔

صبغۃ اللہ

اب ذرا ایک نظر اس ''صِبغۃُ اللہ'' پر بھی ڈال لیجیے جس میں اس اصولی طریق کار نے جماعت اسلامی اور اس کے ارکان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو رنگ دیا تھا۔
اس سلسلے میں پہلے دو باتیں نوٹ فرما لی جائیں۔ ایک یہ کہ جماعت میں داخلہ کی شرائط اور اس کا طریق کیا تھا

اور دوسرے یہ کہ آئندہ کے بارے میں پہلے ہی قدم پر کیا تنبیہات کر دی گئی تھیں۔ پہلی بات کے لیے ملاحظہ ہو:
''جماعت کی شرائطِ رکنیت'' (ماخوذ از دستورِ جماعت اسلامی)

''ہر وہ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو' اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کا باشندہ ہو جو عقیدہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کر یہی اس کا عقیدہ ہے' وہ اس جماعت کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

تشریح: اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہو گا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمہ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا (اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے' بلکہ صرف یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے جو جماعت ہم بنا رہے ہیں اس میں شامل ہونے کے لیے اس قسم کے مسلمان غیر مفید ہیں)۔ اس دائرے میں آنے کے لیے شرطِ لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمہ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو' وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا' اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اور یہ شہادت اس کے طرزِ خیال و طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہ کہنے کی جرأت کرے' صرف وہی اس جماعت میں داخل ہوسکتا ہے خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے' یا پیدائشی مسلمان

ہو اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔''

اس طریق پر ادائے شہادت کے بعد ہی ایک شخص اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کر سکتا تھا۔ اس کے بعد اب ذرا ان ''تغیرات'' کا بھی جائزہ لے لیا جائے جو از روئے دستور' جماعت اسلامی کے ارکان کو رکن بننے کے بعد اوّل لازماً اور دوم حسبِ توفیق تدریجاً اپنی زندگیوں میں لانے ضروری تھے:

(۱): ''ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو اپنی زندگی میں لازماً کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:

(ا) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے۔

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے۔

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعۂ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے (مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادتِ زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ) تو اس کو ترک کر دے، بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا کچھ حصّہ شامل ہو تو وہ اس حصّہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے۔

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائیداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہوجائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ (یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہو گا جہاں حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورتِ دیگر صرف توبہ اور آئندہ کے لیے طرزِ عمل کی اصلاح کافی ہو گی)

(ھ) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر، یا رئیس یا گورنر یا وزیر، یا جج ہو جو زمین کے کسی حصّہ پر حاکمیت کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے۔

(و) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رُکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ جو مجلس قرآن اور سُنّت رسول ﷺ کو اساس اور منبع قانون تسلیم نہ کرے، اسلام کی رو سے اس کو انسانی زندگی کے لیے قوانین بنانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور اس

کی رکنیت قبول کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے۔

(ز) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہوں تو اس کو واپس کرے اور ان وفاداریوں اور نیازمندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔ یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمہ شہادت ادا کرنے

میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا' یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا۔''

(۲): ''ادائے شہادت کے بعد جو تغیرات ہر رکن جماعت کو بتدریج اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:

(ا) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت ہو جائے۔

(ب) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر' خیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا' اپنی زندگی کے مقصد' اپنی پسند اور قدر کے معیار اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا اور اپنی خودسری اور نفس پرستی کے بُت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا۔

(ج) ان تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہوں اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا۔

(د) ان تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جس کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔

(ھ) فاسقین اور فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا۔

(و) ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو۔ (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے

معاملات کیے جا سکتے ہیں' مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے۔ کوئی رکن جماعت انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزو نہیں بن سکتا)

(ز) اپنے معاملات کو راستی' عدل' خدا ترسی اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا۔

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جُہد کو قیام حکومت الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا ان تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجے پر ہوں مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہو گی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین

ہو گا۔‘‘

- اور دوسری بات کے لیے ملاحظہ ہو: (اقتباس از ’’ایک صالح جماعت کی ضرورت‘‘)

’’لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہو گا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے‘ پھر ایشیا‘ یورپ‘ افریقہ‘ امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے ... دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے‘ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہو گا اور وہ اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع ہوں‘ جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں‘ جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں‘ جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اس کو خود چھوڑ دیں۔ پھر ان کو فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہو گی‘ اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہو گا۔ ان تمام فائدوں‘ لذتوں‘ آسائشوں اور امیدوں کو جو اس نظام سے وابستہ ہوں چھوڑنا ہو گا اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات‘ تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہو گا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو

مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدّوجُہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہو گا‘ اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے‘ اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا‘ قید اور جلا وطنی اور ضبط اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب آیا ہے اور نہ آ سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا ... زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر

سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جفا کشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔''

اس انتباہ کو قبول کر کے ---- اور مذکورہ بالا طریق پر جو لوگ جماعت اسلامی میں داخل ہوئے ان کی زندگی میں مندرجہ ذیل چند چیزیں بالکل نمایاں اور واضح تھیں۔ جن لوگوںکو بھی اس زمانے میں جماعت اسلامی کے اراکین کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا وہ ان چیزوں کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے اور مخالفین تک نے خواہ لساناً ان باتوں کا اعتراف نہ کیا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل بھی جماعت اسلامی کے اراکین کے خلوص اور عزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دبی دبی زبان سے اس کا اعتراف بھی بارہا مواقع پر ہوا۔

۱۔ نو مسلمانہ جوشِ کار

سب سے پہلی چیز جماعت اسلامی کے ارکان کا یہ احساس تھا کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے ''نو مسلم'' ہیں۔ انہوں نے اس سے قبل محض ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے اسلام کو اپنا ایک قومی اور نسلی مذہب سمجھا تھا اور اس طرح اب تک وہ بس ''نسلی مسلمان'' تھے۔ جوں ہی ان پر اسلام کی حقیقت منکشف ہوئی انہوں نے شعوری طور پر نسلی اسلام کو چھوڑ کر حقیقی اسلام کو قبول کیا۔ اس چیز نے ان کے دلوں میں بعینہٖ وہی احساسات و جذبات اُجاگر کر دیے کہ جو ایک نو مسلم کے قلب میں پہلی مرتبہ اسلام قبول کرتے ہوئے

پیدا ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے قائد اور مؤسس جناب مودودی صاحب نے ''سیاسی کشمکش'' حصّہ سوم کی ابتدا ہی میں فرمایا تھا:

''پس مَیں در حقیقت ایک نو مسلم ہوں۔ خوب جانچ پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل اور دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے صلاح و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے ... ''

تشکیل جماعت کے وقت دستور جماعت کی منظوری کے بعد جماعت اسلامی میں داخلے کی کیفیت ملاحظہ ہو:

''اس کے بعد سب سے پہلے مودودی صاحب اُٹھے اور کلمہ شہادت اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کا اعادہ کیا اور کہا کہ لوگو! گواہ رہو کہ میں آج از سر نو ایمان لاتا ہوں اور جماعت اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور آپ نے بھی مودودی صاحب کی طرح تجدید اِیمان کا اعلان کیا۔ بعد ازاں حاضرین میں سے باری باری کر کے ہر شخص اٹھا، کلمہ شہادت ادا کیا اور جماعت میں شریک ہوا۔ اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، بلکہ بعض لوگوں پر تو روتے روتے رقت طاری ہو گئی تھی۔ قریب قریب ہر شخص کلمہ شہادت ادا کرتے ہوئے ذمہ داری کے احساس سے کانپ رہا تھا ...'' (''روداد جماعت

اسلامی'' حصّہ اوّل)

اس کے بعد واقعتاً جماعت اسلامی کے ارکان نے ثابت کیا کہ وہ ''نو مسلم'' ہیں۔ شمولیت جماعت کے بعد کی زندگی ان کی پہلی زندگی سے بالکل ممیز اور مختلف تھی۔ ایک بالکل ہی نئی کیفیت اور ایک بالکل ہی نئی شان ان کی زندگی' ان کے افکار' ان کے خیالات' ان کے نظریات' ان کے مشاغل' ان کی دلچسپیوں اور ان کی دوستیوں اور دشمنیوں پر طاری ہو گئی تھی۔ یہ کیفیت ان کی اپنی قبل از جماعت کی زندگی سے بھی بالکل مختلف تھی اور ان کے ارد گرد جو لاکھوں کروڑوں ''نسلی مسلمان'' بس رہے تھے' ان کی کیفیت سے بھی بالکل جدا تھی! یہ پرانے ماحول میں بالکل نئی قسم کے افراد تھے اور ان کا ''نیا پن'' ان کے آس پاس کا ماحول پوری شدّت سے محسوس کرتا تھا۔

۲۔ تناقض اور نفاق سے بیزاری

ان کی زندگی کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب ان میں ''تناقض'' اور ''نفاق'' کا وجود نہیں رہا تھا اور وہ چورنگی اور پچرنگی زندگی تو درکنار دو رنگی تک کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے' بلکہ ''صبغۃ اللہ'' میں رنگ کر بالکل یک رنگ ہو گئے تھے۔ وہ جس چیز کے مدّعی تھے' پہلے اسے خود اپنی زندگی میں قائم کرتے تھے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی اور بڑے سے بڑا نقصان انہیں گوارا تھا۔ انہیں جو تعلیم دی گئی' وہ یہ تھی:

''قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے پر نکلیں' اس باغی کو مطیع بنایئے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہو گی کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کریں۔'' (''روداد'' دوم)

اور

''ہمارا مطالبہ ہر مؤمن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو' یک سُو ہو' یک رنگ مؤمن و مسلم ہو۔ ہر اس چیز سے کٹ جائے (اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدّوجُہد کرتا رہے) جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریق زندگی کے منافی ہو اور اچھی طرح مقتضیات ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے ... ''

(دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات)

اور

''ہم در اصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت اور صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو... صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو' راست باز اور دیانت دار بھی ہو' خدا کے پسندیدہ اخلاق اور اوصاف سے بھی آراستہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت اور قابلیت سے ان کو شکست دے۔'' (ایضاً)

اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس جماعت کے کارکنوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ لوگ ایک طرف دین داروں سے بڑھ کر دین دار تھے اور دوسری طرف معاملات دنیا میں بھی پوری طرح منہمک تھے۔ لیکن اس انہماک کی شان یہ تھی کہ اس میں کہیں نہ دروغ گوئی تھی نہ بددیانتی' نہ دھوکا تھا' نہ کینہ بلکہ ایک پاک و صاف زندگی جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو' اس جماعت کے کارکنوں کا طرۂ امتیاز تھی۔ یہ لوگ اپنے اپنے ماحول میں بالکل اسی طرح چمکتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو۔

اس جماعت کی کیفیت عجیب معجز نما تھی کہ جہاں کوئی شخص اس میں داخل ہوا' اس کی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا ہو گیا۔ وہ دہریے اور ملحد جنہیں دین سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو نماز' روزے کا مذاق بطورِ فیشن اڑانے کے عادی ہو گئے تھے' اس جماعت سے متعلق ہوئے تو پابندیٔ صوم و صلوٰۃ ان کی زندگی کا جزو لاینفک ہو گئی۔ وہ چہرے جو ہر روز صبح ہی صبح استرے کی رگڑ کے عادی تھے یکایک داڑھیوں سے مزین نظر آنے لگے اور وہ اوقات جو سیر و تفریح اور خوش گپیوں میں صرف ہوتے تھے' اب سنجیدگی کے ساتھ سوچنے' مطالعہ کرنے اور دین کی دعوت کے پھیلانے میں صرف ہونے لگے۔

ان میں سے جس کسی سے کسی کا تعلق قائم ہوا وہ ان کے خلوص' ان کی بے ریا محبت' ان کی بے لاگ دیانت اور ان کی کھری اصول پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جسے بھی ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آیا' اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ معاملات میں نہایت کھرے اور لین دین میں دیانت اور امانت کی کسوٹی پر پورے اترنے والے ہیں۔

انہوں نے جس شریعت کی پابندی کو شعوری طور پر قبول کیا تھا' عملاً اس کی پیروی کرکے دکھائی۔ ''حلال اور حرام'' کی قیود ان کے لیے بس از منۂ قدیم کی باتیں ہی نہ تھیں' عملی زندگی کی ایسی پابندیاں بن گئیں جن میں انہوں نے اپنی زندگیوں کو باندھ کر دکھایا اور اس شان سے باندھ کر دکھایا کہ بے اصولے اور نسلی مسلمانوں کو اپنی

شرمندگی اور خجالت کو چھپانے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہ سوجھا کہ ان پر ''دقیانوسیت'' اور ''ملائیت'' کی پھبتیاں کسیں اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں فرق کرنے کو ان کی سادہ لوحی پر محمول کریں۔

انہوں نے کہا: ''غیر الٰہی حکومت کی ملازمت حرام ہے'' ---- اور پھر اچھی اچھی ملازمتوں اور بڑی بڑی تنخواہوں کو ٹھکرا دیا اور اپنے لیے ہزاروں طرح کی معاشی مشکلات پیدا کرنے سے انہیں کوئی چیز اس لیے نہ روک سکی کہ ان کے نزدیک ''حق'' یہی تھا۔

اس اصول پسندی اور حق پرستی سے جہاں ان کا اخلاق وقار اور رعب آس پاس کے ماحول پر قائم ہو رہا تھا' وہیں ساتھ ساتھ اس ماحول کے ساتھ تصادم کی بنیاد بھی پڑ رہی تھی۔ پہلے ہی قدم پر ان سے کہہ دیا گیا کہ:

''آپ بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصولوں کے اتنے پابند ہو جائیں کہ آپ کے گرد وپیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہوں وہ آپ کی پابند اِصول زندگی کو گوارا نہ کر سکیں ... '' (''روداد'' دوم)

اور جماعت اسلامی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:

''ان خصوصیات میں سب سے مقدّم خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ ماحول میں آپ غربت کا احساس کریں ... غربت سے میرا مقصد یہ ہے کہ موجودہ فضا میں آپ کو ہر جگہ اجنبیت کا احساس ہو۔ خاندان میں' سوسائٹی میں' قوم میں آپ کو اپنے ہم درد اور آشنا و ہم خیال و ہم مشرب بہت کم نظر آئیں۔ آپ کو ہر مجلس میں احساس ہو کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں' دوسروں کی چاہت اس سے مختلف ہے۔ آپ جو کچھ سوچتے ہیں' دوسروں کا فکر اس سے بالکل الگ ہے۔ آپ کا مذاق' آپ کا رجحان' آپ کا خیال اور آپ کا ارادہ ہر چیز دوسروں کے مذاق' رجحان اور خیال و ارادہ سے متبائن بلکہ متصادم نظر آئے ... '' (''روداد'' چہارم)

اور جب واقعتاً یہ کیفیت رونما ہو گئی تو کہا گیا:

''اب تک جہاں جہاں سے اس کشمکش کی اطلاعات آ رہی ہیں' وہاں کے لوگوں سے مطمئن ہو رہا ہوں اور جہاں سے ایسی اطلاعات نہیں آ رہی ہیں وہاں کے لیے بے تابی سے منتظر ہوں کہ ایسی کوئی اطلاع ملے ... '' (''روداد'' دوم)

یہ تصادم اور کشمکش ''اصول پرستی'' اور ''بے اصولے پن'' ----- اور ع ''چلو تم ادھر کو

ہوا ہو جدھر کی'' اور ''فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ'' کے مخالف نظریات کا تصادم تھا اور اس کشمکش میں جماعت اسلامی کا ہر فرد مبتلا تھا۔ پھر یہ کشمکش کوئی محدود کشمکش نہ تھی بلکہ ہر شخص کے گھر اور خاندان سے لے کر پورے معاشرے اور

ماحول کے ساتھ تھی۔ ؎

لشاکشِ خس و دریا ہے دیدنی کوثرؔ
اُلجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے !

۳۔ بے پناہ جذبۂ عمل

اس دور کی ایک اور اہم خصوصیت وہ بے پناہ جوش کار تھا جو جماعت کے ہر فرد میں پایا جاتا تھا' عام اس سے کہ وہ رکن ہو یا ہمدرد۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں نہ دنیا بنانے کی فکر ہے نہ گھر بار جمانے کی۔ نہ جاہ و حشمت کی کوئی طلب ہے نہ مال و دولت کی کوئی حرص۔ انہیں دُھن ہے تو بس ایک بات کی اور سودا ہے تو بس اس کا کہ اللہ کے دین کا چرچا عام ہو' اس کا کلمہ سربلند ہو اور دین حق دنیا میں قائم ہو جائے۔ اسی کے لیے وہ زندہ تھے اور اسی کے لیے مرنا چاہتے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا:

''مجاہدہ فی سبیل اللہ کے لیے تیسری صفت دل کی لگن ہے ...یہاں تو اس کی ضرورت ہے کہ دل میں اک آگ بھڑک اٹھے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی آگ تو شعلہ زن ہونی چاہیے جتنی اپنے بچے کو بیمار دیکھ کر ہوتی ہے اور آپ کو کھینچ کر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے یا اتنی جتنی گھر میں غلہ نہ پا کر بھڑکتی ہے' اور آپ کو تگ و دو پر مجبور کر دیتی ہے اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سینوں میں وہ جذبہ ہونا چاہیے جو ہر وقت آپ کو اپنے نصب العین کی دُھن میں لگائے رکھے' دل و دماغ کو یک سُو کر دے اور توجہات کو اس کام پر ایسا مرکوز کر دے کہ اگر ذاتی یا خانگی یا دوسرے غیر متعلق معاملات کبھی آپ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچیں بھی تو آپ سخت ناگواری کے ساتھ ان کی طرف کھنچیں۔ کوشش کیجیے کہ اپنی ذات کے لیے آپ قوت اور وقت کا کم سے کم حصّہ صرف کریں اور آپ کی زیادہ سے زیادہ جدّوجُہد اپنے مقصد حیات کے لیے ہو ... '' (''روداد'' دوم)

اور بالکل یہی کیفیت جماعت اسلامی کے کارکنوں میں نمودار ہو گئی۔ ان کی گرم جوشی اور

اپنے مقصد حیات کے لیے ''فنائیت'' اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہیں Fanatic کہا جانے لگا۔ یہ جوشِ کار براہ راست نتیجہ تھا اس نو مسلمانہ احساس کا جو جماعت کے ارکان کے قلوب میں جاگزیں تھا۔ انہوں نے دین کو شعوری طور پر قبول کیا تھا اور اپنا تن' من' دھن سب کچھ اس کے لیے قربان کرنے کو تیار تھے۔ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ انہیں نہ آرام کا خیال تھا نہ چین کا' نہ استراحت انہیں عزیز تھی نہ سیر و تفریح' نہ تکان کا عذر ان کی طرف سے پیش ہوتا تھا نہ عدیم الفرصتی کا۔ وہ سب ''ہمہ وقتی کارکن'' تھے جن کے تمام اوقات' تمام

صلاحیتیں اور تمام قوتیں اسی ایک کام کے لیے وقف تھیں ماسوائے ان کے اس تھوڑے سے حصے کے جو معاش اور دنیا کی دوسری ناگزیر ضروریات کے لیے لابُدّ منہ تھا۔

اس کام کے لیے ایثار کی بھی انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں کہ جنہیں دیکھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایثار نگاہوں کے سامنے پھر جائے۔ بڑی بڑی ملازمتوں اور تنخواہوں کو انہوں نے چھوڑا۔ بڑے بڑے خوشنما مستقبل (careers) سے انہوں نے نگاہوں کو پھیرا۔ کاروبار کا ضیاع انہوں نے برداشت کیا اور اپنے مقصد کی لگن اور اپنے کام کی دُھن میں انہوں نے دنیا کی ہر اس چیز کا نقصان اور زیاں برداشت کیا جس کا نقصان و زیاں ہر انقلابی تحریک کے کارکنوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ (۱۵)

اس راہ کی ہر مصیبت کو انہوں نے جھیلا اور ہر تنگی کو برداشت کیا۔ جو مشکل آئی اس کے مقابلے کے لیے تیار ہوئے اور جو الجھن پیش آئی اسے حل کیا۔ کسی مصیبت سے ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور کسی مشکل نے انہیں ہراساں نہ کیا۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جان لو کہ تمہارے عزم کی پختگی اور تمہارے دعویٰ ایمان کی سچائی کو آزمایا جائے گا۔

{وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ} (البقرۃ:۱۵۵)

---

(۱۵) خیریت ِجاں‘ راحت ِتن‘ صحت ِداماں سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی (فیض)

یہ لوگ پہلے ہی یہ انتباہ سن چکے تھے کہ:

’’اس انقلاب کی جدّوجُہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہو گا‘ اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے ہوں گے‘ اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا ہو گا‘ قید اور جلا وطنی اور ضبط اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے --- اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی۔‘‘

(’’ایک صالح جماعت کی ضرورت‘‘: مولانا مودودی)

اور پھر بار بار بھی ان کے کان کھولے جاتے رہے:

’’حالات نا مساعد ہوں تو ہوا کریں‘ دنیا میں کب حق کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ کب ایسا ہوا کہ اہلِ حق چلے ہوں اور چوبداروں نے ان کے آگے ہٹو بچو کی صدائیں بلند کی ہوں۔ حق کی راہ میں طائف اور غارِ ثور‘ خندق اور احزاب کا ہونا ضروری ہے۔ حق کی خاطر رسول ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے‘ دندان مبارک شہید کیے گئے‘ سر پر اوجھ ڈالی گئی‘ ہر طرح کی اذیت پہنچائی گئی۔ بد قسمت ہیں ہمارے وجود اگر ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے۔

حق پرستی کے راستے میں کب مشکلات حائل نہ تھیں... مشکلات تو اس راہ میں اعوان و انصار کی حیثیت رکھتی ہیں...
''(''دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات'' :مولانا امین احسن اصلاحی)

اور واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان نے اس راہ کی مشکلات اور تکالیف کو ''اعوان و انصار'' ہی سمجھا!

۴۔ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ

ایک اور بہت نمایاں چیز جو اس دور اوّل میں جماعت اسلامی کے ارکان اور متعلقین میں پائی جاتی تھی‘ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان ''رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ''کی جھلک تھی۔ ان کے درمیان انتہائی گہرا رشتہ اخوت و محبت پایا جاتا تھا۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور ہم مقصدیت نے ان کے اندر ایک ہونے کا ایک بہت گہرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دکھ اور سکھ‘ مشکلیں اور آسانیاں سب مشترک تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور ایک دوسرے کے رنج و غم اور راحت و مسرت میں برابر کے شریک تھے۔ اس کی تلقین بھی انہیں جماعت کے اکابرین کی طرف سے واضح الفاظ میں ہوئی تھی:

''آپ اپنی ساری وابستگی اور دلچسپی ان لوگوں کے ساتھ بڑھائیں جو اصول و مقاصد میں آپ کے ساتھ متحد ہوں۔ اگر ان کی تعداد کم ہو تو اس کی پروا نہ کیجیے۔ انہی کی رفاقت اور نصرت کی قدر کیجیے۔ اگرچہ وہ آپ کے عزیز نہ ہوں لیکن آپ انہیں عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھیے... آپ ہر طرف سے کٹ کر اپنی ساری دلچسپیاں صرف ان ہی کے اندر ڈھونڈیئے۔ یہی آپ کے عزیز ہوں‘ یہی آپ کے دوست ہوں‘ یہی آپ کے غم خوار ہوں... آپ کا گھرانا اہل حق کا گھرانا ہو۔ جن کا رشتہ اہلِ حق کے ساتھ جتنا ہی ضعیف ہو‘ آپ کا رشتہ ان کے ساتھ اتنا ہی ضعیف ہونا چاہیے اور جن کا رشتہ ایمان کے ساتھ جتنا ہی مضبوط ہو‘ آپ کا رشتہ ان کے ساتھ اتنا ہی مضبوط ہونا چاہیے۔''
(''روداد'' چہارم... تقریر مولانا امین احسن اصلاحی)

یہ تلقین نہ ہوتی تب بھی یہ ایک فطری بات تھی جس کا پیدا ہونا فکر و نظر کی ہم آہنگی اور منزلِ مقصود اور نصب العین کے اشتراک کے بعد ناگزیر تھا۔ جب اقامت دین ان میں سے ہر ایک کا مقصد زندگی تھا اور اسی کے لیے ان میں سے ہر ایک جینے اور مرنے کا تہیہ کرچکا تھا‘ تو فطری بات تھی کہ ان میں ان لوگوں سے ذہنی اور قلبی بعد پیدا ہوتا چلا جاتا جو کسی اور نظریہ اور فکر کے تحت ایک مختلف نصب العین کے لیے کوشاں تھے اور ان لوگوں کے ساتھ قلبی و روحانی روابط استوار ہوتے جو ان کے شریک سفر تھے! اور اس قلبی اور روحانی ربط و تعلق کا جو اس دور میں جماعت کے متعلقین کے مابین پایا جاتا تھا‘ جس شخص کو بھی مزہ چکھنے کا موقع ملا ہے‘ وہ اس کی لذت و

حلاوت کو آج تک محسوس کر رہا ہو گا !

عملی نقشہ کار

جماعت اسلامی کے اراکین کی ان چار خصوصیات کے ساتھ ساتھ دورِ اوّل کی جماعت اسلامی کے طریق کار کی چند ایک خصوصیات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح دورِ ثانی کے ساتھ تقابل میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ میں مندرجہ ذیل چار خصوصیات کو اہم سمجھتا ہوں۔

۱۔ معیارِ ردّ و قبول

اس دور میں جماعت اسلامی کو ''رائے عامہ'' کی بالکل پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس ترک و اختیار اور ردّ و قبول کا صرف ایک معیار تھا اور وہ یہ کہ ''حق'' کیا ہے اور ''ناحق'' کیا۔ قوم پرست سیاسی جماعتوں کی قیادتیں عوام کے چشم و ابرو کے اشاروں پر حرکت کرتی ہیں اور آج کے جمہوری دور میں حدیث نبوی ﷺ کہ ''سیّدُ القومِ خادِمُھم'' چاہے اپنے اصلی رنگ میں جلوہ فرما نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ قوم کے قائد اصل میں قوم کے پیرو ہوتے ہیں ----- لیکن جماعت اسلامی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جو حق ہے اسے بلا خوفِ لَوْمَۃِ لائِمٍ بیان کرو خواہ اسے عوام قبول کریں یا ردّ کر دیں اور خواہ اس پر قوم کی ناراضی اور اس کی عداوت ہی مول لینی پڑے۔

جس دور میں جماعت اسلامی اپنے ان افکار و نظریات کو پوری طاقت سے پیش کر رہی تھی، جس کی ایک ہلکی سی جھلک صفحاتِ گزشتہ میں دکھائی گئی ہے، وہ مسلم لیگ کی تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور مسلمانانِ ہند تقریباً متفق ہو کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن تھے، لیکن عین اسی وقت جماعت اسلامی ''مسلم قومیت'' اور ''مسلم قوم پرستی'' پر بے دھڑک تنقید کر رہی تھی اور ''کتمانِ حق'' کے جرم سے بچنے کے لیے اظہارِ حق کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کر رہی تھی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی دورِ ثانی کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ ابھی دورِ اوّل کی خصوصیات باقی تھیں اور دورِ ثانی کے اپنے نقوش گہرے نہ ہوئے تھے، جماعت کی یہ ''حق پرستی'' اور ''حق گوئی و بے باکی'' اپنی شان دکھاتی رہی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جس جرأت کے ساتھ اپنی

رائے کا اظہار کیا‘ وہ اس کی ایک درخشاں مثال ہے۔ مولانا نے اپنی رائے (قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح تھی یا غلط) جسے وہ ''حق'' سمجھتے تھے‘ کھول کر بیان کر دی اور بالکل پروا نہ کی کہ اس کا ردِّ عمل عوام کی طرف سے کیا ہو گا۔ نتیجتاً جماعت کو سخت عوامی لعن طعن اور ملامت و مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے

''ترجمان القرآن'' بابت جون ۱۹۴۸ء میں فرمایا:

''میرے لیے کسی مسئلہ پر رائے قائم کرنے اور ظاہر کرنے میں یہ سوال سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ لوگوں کے جذبات اس معاملہ میں کیا ہیں اور لوگ کس چیز کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ میرے سامنے اصل سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ اس معاملے میں خدا اور رسولؐ کی ہدایت کیا ہے اور خدا کو کیا چیز پسند اور کیا ناپسند ہے۔ پھر جب مجھے تحقیق سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سُنّت کے مطابق فلاں طرزِ عمل صحیح ہے اور اسی میں خدا کی خوشنودی ہے تو میں خود اس کو اختیار کرتا ہوں اور دوسروں کو اسی کی پیروی کا مشورہ دیتا ہوں۔ اس تحقیق سے اگر کوئی چیز مجھے ہٹا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سُنّت ہی سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ میری تحقیق غلط ہے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی رائے پر اصرار کرنا میں گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر قرآن و سنت میں میری رائے کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہو تو پھر یہ بات میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی کہ فلاں معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات نازک ہیں یا فلاں رائے کو مسلمان ناپسند کرتے ہیں...''

اور واقعہ یہ ہے کہ یہ محض ایک دعویٰ ہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے دورِ اوّل کی ایک نمایاں خصوصیت تھی!

۲۔ تقدیم و تاخیر کا اصول

اس کے کام میں emphasis اور تقدیم و تاخیر کی ترتیب یہ تھی:

* سب سے مقدّم اور سب سے اہم : ذہنی‘ فکری اور علمی انقلاب

* اس کے بعد : عملی و اخلاقی تبدیلی

* اور مؤخر ترین : رفاہِ عامہ اور خدمتِ خلق کے کام

اور اصولاً ایک ''انقلابی جماعت'' کے طریق کار میں یہی ترتیب ہونی بھی چاہیے۔

(i) علمی انقلاب :جماعت کے نزدیک سب سے زیادہ ضروری اور مقدّم کام علمی انقلاب کا تھا اور اس دور میں جماعت کی اکثر وبیشتر مساعی اسی کام کے لیے صرف

ہوئیں۔ جماعت یہ سمجھتی تھی' اور یہ سولہ آنے صحیح بھی تھا' کہ اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا اس وقت تک جنت الحمقیٰ میں رہنے کے مترادف ہے جب تک موجودہ دور کے گمراہ کن نظریات' افکار اور فلسفے کا مقابلہ ایک زبردست اسلامی علمی تحریک کے ذریعے کر کے انہیں شکست نہ دے دی جائے۔ چنانچہ جماعت اپنے مقدور بھر اس ''علمی انقلاب'' کے لیے سعی و جُہد کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مسلسل ایسے نظام تعلیم کے قیام کے لیے کوشاں تھی اور اس طرح کی تعلیمی تجاویز اور schemes پر سوچ و بچار کر رہی تھی جو اس علمی تحریک کے لیے محققین اور ریسرچ سکالرز کی ایک جمعیت فراہم کر کے دے سکے ---- بہر حال یہ کام جماعت کے نزدیک اہم ترین اور مقدّم ترین تھا۔

(ii) عملی و اخلاقی انقلاب: علمی انقلاب کے لیے سعی کے بعد جس کام پر جماعت کی سب سے زیادہ مساعی صرف ہو رہی تھیں' وہ یہی عملی و اخلاقی اصلاح کا کام ہے۔ لیکن اس اخلاقی اصلاح کے لیے بھی جماعت اسلامی نے اپنا ایک مخصوص طریق کار وضع کیا تھا۔

اس کے نزدیک اصلاحی انجمنیں اور ادارے بنا کر کچھ سطحی تدابیر سے اصلاح اخلاق کا کام کرنے کی کوشش کرنا حماقت محض تھا۔ وہ یہ جانتی تھی' اور بالکل صحیح طور پر جانتی تھی' کہ انسانی اخلاق نظام انسانی میں کوئی علیحدہ یا سطحی چیز نہیں ہوتے بلکہ ان کی جڑیں انسان کے نظریات اور افکار اور اس کے عقائد و تصوّرات میں گہری اتری ہوئی ہوتی ہیں اور ان میں انقلاب برپا کیے بغیر انسان کے اخلاقی رویہ میں تبدیلی کی توقع رکھنا عبث اور اس کی کوشش کرنا وقت اور قوت کا ضیاع ہے (ملاحظہ ہو ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' مصنفہ مولانا مودودی)۔ لہٰذا اس نے اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لیے اس قسم کی سطحی تدابیر اور آسان تجاویز کو استعمال کرنے کی غلطی نہ کی بلکہ پہلے افکار و نظریات کے انقلاب (بذریعہ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ آیٰتِہٖ) اور اس کے بعد تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق (یعنی یُزَکِّیۡہِمۡ) کے

طریق کار کو پیش نظر رکھا۔

(iii)رفاہِ عامہ کے کاموں کی حیثیت:

رہا رفاہِ عامہ اور خدمت ِخلق کے کاموں کا مسئلہ تو اس معاملے میں اس دور کی جماعت اسلامی تقریباً خاموش معلوم ہوتی ہے۔

انفرادی طور پر ان کاموں کے کرنے کی تلقین و ترغیب تو چند ایک جگہوں پر نظر آتی ہے لیکن اس کے لیے کسی اجتماعی سعی و منظم کام کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ خصوصاً تعلیم بالغاں کی تلقین اور اس پر زور دار ترغیب کئی مقامات پر ملتی ہے لیکن اس کے لیے بھی کوئی منظم کوشش غالباً نہیں کی گئی۔

اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر بالکل فطری اور صحیح ہے۔ رفاہِ عامہ اور خدمت خلق کے کام ''سیاسی جماعتوں'' کے کرنے کے ہوتے ہیں نہ کہ ''انقلابی جماعتوں'' کے۔ سیاسی جماعتوں کے لیے جن کے پیش نظر ایک خاص نظام ہیں'اس نظام کو اصولاً حق سمجھتے ہوئے' صرف اس کے انتظام کرنے والے ہاتھوں کو بدلنا ہوتا ہے'بالکل صحیح ہے کہ وہ اس قسم کے کام کر کے عوام میں مقبولیت حاصل کریں اور اپنے آپ کو عوام کا سچا خادم اور ہمدرد ثابت کریں تاکہ وہ ان کے ہاتھ میں اپنے اقتدار کی باگیں تھما دیں'لیکن انقلابی جماعت کے پاس کہ جس کے پیش نظر اس نظام ہی کو بدلنا ہو اس قسم کے کاموں کے لیے نہ وقت ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کام اس کے لیے کچھ مفید ہوتے ہیں۔ اس کے نقطۂ نظر سے تو عوام کی سب سے بڑی ''خدمت'' بھی یہی ہوتی ہے کہ جس چیز کو اس نے ''حق'' پایا ہے اسے ان کے سامنے واضح کر دے ---یہی وجہ ہے کہ ان کاموں میں سے کسی کام کو جماعت نے اس دور میں درخورِ اعتناء سمجھا تو وہ صرف تعلیم بالغاں کا کام تھا جس کے ذریعے در اصل اپنے پیش نظر علمی و اخلاقی انقلاب ہی کے لیے راہیں ہموار کرنا تھا۔ اس کے سوا کسی اور کام کی طرف جماعت نے مِن حیث الجماعت توجّہ نہ کی!

۳۔ جماعت سے وابستگی کی شکلیں

اس دور میں جماعت اسلامی نے اپنے ساتھ تعلق کی دو شکلوں یعنی رکنیت اور ہمدردی و اتفاق میں سے emphasis جس پر دیا وہ رکنیت تھی! ----- اور اس پر emphasis اس قدر زیادہ تھا کہ صرف اسی کو واحد صحیح شکل کی حیثیت سے بیان کیا جاتا تھا۔ اُس وقت اصل کوشش اس بات کی ہوتی تھی کہ ہر شخص جماعت کا رُکن بنے اور تن مَن دھن کے ساتھ (بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ) جماعت کے اندر شامل ہو جائے۔ ہمدردی کا

شعبہ رکھا بھی گیا تھا تو اس اصل شعبے کی ابتدا اور دیباچے کے طور پر، نہ کہ اس کے مستقل فوائد کے پیش نظر۔

جماعت کا کہنا یہ تھا کہ جو کچھ ہم پیش کر رہے ہیں وہ حق ہے اور وہی حق ہے --- اور جو شخص اسے قبول کرے اس کا فرض ہے کہ ہمہ تن اسی کا ہو کر رہے اور اپنی کسی چیز کو اس سے آزاد نہ رکھے (اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً) --- پہلے اپنی زندگی میں اس ''حق'' کو عملاً قائم کرے اور پھر اس کو پوری دنیا میں قائم کرنے (اقامت ِدین) کے لیے اپنی جان، مال، صلاحیت، قوت اور وقت کو وقف کر دے! اس حق کو حق مان کر پھر اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا یا اس کا اظہار کر دینا ----- یا اس کے ساتھ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تعاون کر دینا ایک فضول اور لا حاصل بات ہے۔

''روداد'' چہارم میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تقریر میں ''ہمدردانِ جماعت سے خطاب'' ---- کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم نے جماعت کے ساتھ ہمدردوں کا ایک شعبہ محض بعض وقتی اور عارضی مصالح کے لیے رکھا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے ایسے لوگوں کے لیے بھی یہ شعبہ مامن کا کام دے رہا ہے کہ جن کی اصل جگہ جماعت کے نظام کے اندر تھی نہ کہ ہمدردوں کی صفوں میں ... اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض صرف اس طرح ادا نہیں ہو سکتے کہ آپ اس جماعت کے ساتھ فی الجملہ ہمدردی رکھتے ہوں جو ان فرائض کو پورا کرنے کے لیے اٹھی ہے بلکہ آج ان کے ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ اپنا تمام سرمایۂ زندگی اس جماعت کو برپا کرنے میں لگا دیں جو اس مقصد کے لیے اٹھے ... مجرد دعا گوئی اور اظہار ہمدردی کو ادائے فرض کی ایک قسم سمجھ لینا اور اس پر قانع ہو جانا سخت پست ہمتی اور کمزوری کی بات ہے ... یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہم اس مسئلہ پر غور کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمدردوں کا ایک مستقل شعبہ رکھنا کچھ مفید ہے یا نہیں ... ہم آپ کے سامنے اللہ کا دین پیش کر رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ آپ کی زندگی کا صرف ایک جزو نہیں بلکہ یہی کُل ہے۔ اگر ہماری بات میں کوئی غلطی اور ہمارے استدلال میں کوئی خامی ہے تو آپ

اس کو واضح کر دیجیے تاکہ ہم اس غلطی کی اصلاح کر لیں اور اس خامی کو دور کر دیں لیکن اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حق وہی ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیںکہ ہم نے آپ پر اللہ کی حُجّت تمام کر دی اور آپ کے لیے حق سے اعراض یا انحراف کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے صحیح راہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ اس حق کو آپ مردانہ وار قبول کریں جو آپ پر واضح ہو چکا ہے ...''

۴۔ نظام ِمالیات

آخری اور اہم خصوصیت اس کا مخصوص نظام مالیات تھا۔ اس سلسلے میں اس نے:

اوّلاً : عوامی چندوں سے اپنے دامن کو بالکل پاک رکھا اور ان تمام ذرائع کو قطعاً استعمال نہ کیا جو اس زمانے میں (اور آج بھی) مختلف سیاسی و دینی جماعتیں فراہمی زر کے لیے استعمال کرتی تھی۔

ثانیاً : فراہمی زر کا اصل الاصول یہ تھا کہ جن لوگوں کو جماعت اور اس کے کام سے اتفاق اور دلچسپی نہیں ہے‘ان سے مالی اعانت طلب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان سے تو ہمارا تمام تر خطاب یہ ہے کہ وہ اس حق کو قبول کریں جو ہم پیش کر رہے ہیں --- اس کام کے اخراجات کا بوجھ ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے کہ جو اس کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اسے اپنا کام سمجھتے ہوں اور انہیں چاہیے کہ وہ بلا کسی کے کہے اور مانگے از خود دیں اور صرف رضائے رب کے لیے دیں --- نہ ان کا نام کہیں شائع ہو گا‘نہ ان کا شکریہ ادا کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے پاس جا جا کر اعانت کی اپیل کی جائے گی۔

ثالثاً : جماعت کا بجٹ ’’نیچے سے اوپر کی طرف‘‘ چلتا تھا۔ یعنی جتنی رقوم مقامی جماعتوں کو حاصل ہوتی تھیں‘ان کا ایک حصّہ وہ اپنے لیے رکھ کر باقی حلقہ کو ارسال کر دیتی تھیں اور حلقہ جات اپنے اپنے حصص رکھ کر بقیہ مرکز کو ارسال کر دیتے تھے۔ رقوم ’’اوپر سے نیچے کی طرف‘‘ عائد نہ کی جاتی تھیں۔

رابعاً: جماعت کے ’’بیت المال‘‘ کے بارے میں اُمراء اور دوسرے ذمہ دار حضرات

کے احساسات انتہائی نازک تھے اور وہ اس کے ایک ایک پیسے کی حفاظت پر اپنی اُخروی نجات کو منحصر خیال کرتے تھے۔

* * *

خاتمہ کلام

ان نقوش پر کہ جو صفحاتِ گزشتہ میں ثبت کیے گئے ہیں‘ سرسری طور پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا یہ دورِ اوّل کم از کم ظاہری اعتبار سے بالکل وہی نقشہ پیش کرتا ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کا خاصہ رہا ہے۔ بالکل وہی افکار و نظریات و عقائد ----- اور بعینہٖ وہی دعوت پیش کی گئی کہ جو انبیاء کرام پیش کرتے آئے ہیں اور بہت حد تک وہی نصب العین اختیار کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریق کار اختیار کیا گیا کہ جو ان کی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ ان دونوں کے نقوش میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور بنظر ظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک میں کوئی خامی اور کمی نہ تھی اور یہ ہر اعتبار سے مکمل تھی‘ اس لیے کہ اس میں خامیاں اور کوتاہیاں بہر حال موجود تھیں جن پر آئندہ کسی جگہ مجھے بھی اپنی محدود بصیرت کے مطابق کلام کرنا ہے‘ لیکن جو بات ایک گونہ اطمینان اور وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنی نوعیت‘ اپنے بنیادی افکار و خیالات‘ اپنی دعوت اور اپنے طریق کار اور اس میں ترتیب اور تقدیم و تاثیر کے اعتبار سے‘ تھی بہر حال اسلام کے اصولوں کے مطابق اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تحریکوں کے نقش قدم پر۔

تحریک کی ابتدا ہی سے اس کے مؤسس اور قائد کو اس کی نوعیت کا پورا پورا احساس تھا۔ ان کے نزدیک یہ تحریک جزوی اصلاح کی علمبردار نہ تھی اور نہ ہی اس کی طرف سے ''حق'' صرف جزءً پیش ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس یہ پورے حق کو پیش کر رہی تھی اور اس اعتبار سے انبیاء کرامؑ کی تحریکوں کی وارث اور نبی اکرم ﷺ کی تحریک کی جانشین تھی۔

لہٰذا اس کا معاملہ دنیا کی دوسری تمام تحریکوں سے مختلف تھا۔ مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں ایک ''انتباہ'' ملاحظہ ہو:

''اس موقع پر میں ایک بات نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں‘ وہ یہ ہے کہ اس قسم کی ایک دعوت کا‘ جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے‘ کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جب تک حق کے بعض منتشر اجزاء باطل کی آمیزش کے ساتھ سامنے آتے رہیں‘ ایک مسلمان قوم کے لیے ان کو قبول نہ کرنے اور ان کا ساتھ نہ دینے کا ایک معقول سبب موجود رہتا ہے اور اس کا عذر مقبول ہوتا رہتا ہے‘ مگر جب

پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لیے ناگزیر ہوجاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے اور اس خدمت کو انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑی ہو جو اُمّت ِ مسلمہ کی پیدائش کی ایک ہی غرض ہے' یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے۔ ایسی صورت میں ان دو راہوں کے سوا کسی تیسری راہ کی گنجائش اس قوم کے لیے باقی نہیں رہتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دو ٹوک فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ڈھیل دے اور اس نوعیت کی یکے بعد دیگرے کئی دعوتوں کے اٹھنے تک دیکھتا رہے کہ وہ ان کے ساتھ کیا روش اختیار کرتے ہیں لیکن بہر حال اس دعوت کی طرف سے منہ موڑنے کا انجام آخر کار وہی ہے جو میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ غیر مسلم اقوام کا معاملہ اس سے مختلف ہے' لیکن مسلمان اگر حق سے منہ موڑیں اور اپنے مقصد ِوجود کی طرف صریح دعوت کو سن کر الٹے پائوں پھر جائیں تو یہ وہ جرم ہے جس پر خدا نے کسی نبی کی اُمّت کو معاف نہیں کیا ہے۔

اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے' اس لیے کم ازکم ہندی مسلمانوں کے لیے تو آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے' رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔ مَیں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تو کوئی بنیاد نہیں رکھتا کہ

یہ آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو مل رہا ہے' اس کا علم صرف اللہ کو ہے' ممکن ہے کہ ابھی کچھ اور مواقع مسلمانوں کے لیے مقدّر ہوں' لیکن قرآن کی بنیاد پر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت ہے ایک نازک وقت۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اس وقت دو قسم کی دعوتیں ہیں۔ ایک طرف ہماری یہ دعوت ہے جو مسلمانوں کو ٹھیک اس کام کے لیے بلا رہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلم جماعت کی تاسیس و تشکیل کی واحد غرض قرار دیا ہے اور دوسری طرف وہ دعوتیں ہیں جن کے پیش نظر مسلمانوں کے دنیوی مفاد کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان دو متقابل پکاروں میں سے دوسری پکار کی طرف مسلمانوں کا فوج در فوج لپکنا اور پہلی پکار کو اُمّت کی عظیم اکثریت کا بہرے کانوں سے سننا' اکابر اُمّت اور علماء و مشائخ کا اس سے بے اعتنائی برتنا یا اس کی کھلی یا چھپی مخالفت پر اتر آنا' اور ایک گروہ قلیل کا اس کی طرف بڑھنا بھی تو رکتے اور جھجکتے اور پس و پیش کرتے ہوئے بڑھنا' میرے نزدیک ایک نہایت بری علامت ہے اور ایک عظیم خطرہ ہے جس میں یہ مسلمان قوم اپنے آپ کو ڈال رہی ہے۔'' (''روداد'' دوم)

یہ ایک بہت بڑی بات تھی جو مولانا مودودی نے کہی، لیکن شاید یہ کہا جا سکے کہ ''جماعت اسلامی'' کے مؤسس و قائد کو اس کے کہنے کا حق حاصل تھا ! !

* * *

دورِ ثانی

اور

اُس کی خصوصیات

ع ''تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا''

تحریک جماعت اسلامی کا دورِ ثانی ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے شروع ہوتا ہے اور تاحال جاری ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک جاری رہے۔
تقسیم ہند کے ساتھ ہی جماعت اسلامی ہند بھی دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور ان دونوں کے نظم کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور آزاد کر دیا گیا۔
=ہندوستان میں حالات چونکہ نوعیت کے اعتبار سے بالکل ویسے ہی تھے جیسے تقسیم ہند سے قبل، لہٰذا وہاں کی جماعت انہی اصولوں اور طریق کار پر کام کرتی رہی جن پر اس سے قبل کر رہی تھی ----- لیکن اس کے

لیے کام کے راستے کچھ تو اس تلخی نے بند کر دیے تھے جو ایک رُبع صدی کی اس شدید قومی کشمکش اور کم و بیش دس سالوں کے اس شدید قومی تصادم سے پیدا ہوئی تھی جو مسلمانوں اور ہندوئوں کے درمیان جاری رہا۔ اس جنگ نے فریقین کے جذبات کو اس درجہ برانگیختہ کر دیا تھا کہ مخالف کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کی بات ایک دوسرے کے لیے سننی نا ممکن ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر کو جماعت اسلامی پاکستان کی بعد از تقسیم کی پالیسی نے پورا کر دیا۔ اس پالیسی کی تفاصیل تو آگے آئیں گی، مجملاً صرف اس قدر عرض کر دیا جائے کہ جب اس نے اپنے آپ کو ایک اصولی اسلامی جماعت کی بجائے ایک قوم پرست گروہ کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا تو جماعت اسلامی ہند کے لیے بھی نام کے اشتراک اور قبل از تقسیم کے پیدا شدہ لٹریچر کے اشتراک کے باعث اپنی پوزیشن کو واضح رکھنا مشکل ہو گیا۔

بہر حال جماعت اسلامی ہند اگرچہ اپنے سابقہ نظریات اور طریق کار کے ساتھ صفحہ ہستی پر موجود ہے لیکن اس کی رفتار کار و توسیع مایوس کن حد تک کم ہے اور اب مجملاً ''جماعت اسلامی'' کی حیثیت سے دنیا جس جماعت کو مراد لیتی ہے وہ ''جماعت اسلامی

پاکستان'' ہے! ہندوستان میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ایک محدود حلقہ ''جماعت اسلامی'' سے مراد جماعت اسلامی ہند لے لیتا ہو لیکن ہندوستان کے غیر مسلم عوام ----- اور بیرونِ پاک و ہند پوری دنیا میں ''جماعت اسلامی'' کے نام سے جو جماعت مراد لی جاتی ہے وہ صرف ''جماعت اسلامی پاکستان'' ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ تقسیم ہند کے بعد تیزی کے ساتھ وسعت پذیر جماعت اسلامی پاکستان ہی ہوئی۔ اور اس لیے بھی کہ اس کے مؤسس اور اس کے اہلِ قلم حضرات کا ایک بہت بڑا گروہ بھی پاکستان ہی کی جماعت کے حصے میں آیا۔

= اور اس جماعت نے اپنے دورِ ثانی میں جو طرزِ عمل اختیار کیا اس نے اس کی ہیئت اور نوعیت ہی کو سرے سے بدل کر رکھ دیا۔ مولانا مودودی صاحب نے اسے اسی تحریک کا مرحلۂ توسیع و عملی اقدام قرار دیا ہے کہ جو ۱۹۴۱ء میں شروع ہوئی تھی لیکن میری رائے میں اس دور کا طریق کار اور طرز عمل پہلے دور کے طریق سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان دو ادوار کو ایک ہی تحریک کے دو مراحل کہنا نا ممکن ہے۔ ''اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم'' میں مولانا مودودی صاحب نے فرمایا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعیات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بدھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ اور مسلک کی بنیاد پر عالمگیر برادری بنانے کی کوشش کی، مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کُلی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی

عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹیفک تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا لیکن اوّل یوم پیدائش ہی سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا' لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکی تحریک آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدود کو توڑ کر جہانی تصوّر کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو

عالمگیر ہو' لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی۔''

اور پھر حاشیہ میں تحریر فرمایا:

''بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں۔ اسٹالن اور اس کے طرز عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔''

بعینہٖ یہی کیفیت جماعت اسلامی پاکستان کے ساتھ پیش آئی۔ وہ ایک خالص اصولی اور بین الاقوامی' بلکہ انسانی بنیادوں پر دعوت کی علمبردار بن کر کھڑی ہوئی اور ابتدا میں اس نے نسلی' لسانی' وطنی اور لونی قومیتیں تو ایک طرف خود ''مسلم قوم پرستی'' جو ایک قومیت ہونے کے باوجود بین الاقوامیت کا رنگ بہر حال رکھتی تھی' کی شدّت کے ساتھ مخالفت کی۔ لیکن اس کی یہ شان زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال قائم رہ سکی۔ اس کے بعد اس نے بھی پاکستان میں آکر مسلم قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وائے ع

''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود''

اصولی اعتبار سے طریق کار میں تو یہ فرق ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ اس کے بیج تقسیم سے کچھ عرصہ قبل ہی بوئے جا چکے تھے' لیکن اس کی شبیہہ میں اس نئے طریق کار اور نئی پالیسی کے نقوش کو اُجاگر اور نمایاں ہونے میں کچھ عرصہ لگا۔ اس عبوری دور میں اس کی وہی خصوصیات جو اس نے اپنے دورِ اوّل میں پیدا کی تھیں' نمایاں رہیں لیکن آہستہ آہستہ ''رنگ قدیم'' پھیکا اور ماند پڑتا چلا گیا اور ''رنگ جدید'' غالب آتا چلا گیا ------ تا آنکہ آج اس کے نقوش ایک خالص قومی جماعت کی نقشہ کشی کرتے ہیں اور اس میں ایک اصولی اسلامی تحریک کے نقوش بس ''نقوشِ ماضی'' کی حیثیت سے ان اوراق میں دفن ہو کر رہ گئے ہیں جن پر تقسیم ہند کے قبل کا لٹریچر مشتمل ہے۔

اس دورِ ثانی میں جماعت اسلامی کے نقوش یہ ہیں:

بنائے استدلال: نسلی اسلام

اس دور کے طریق کار کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ اس میں ''نسلی'' اور ''اصلی'' اور ''ظاہری'' اور ''حقیقی'' اسلام کی تمیز ترک کر کے لوگوں کے ظاہری اسلام کو بطورِ اصل موضوعہ تسلیم کر کے استدلال شروع کیا گیا ۔ جس شدّت سے اور جس طرح لگی لپٹی رکھے بغیر دورِ اوّل میں ''رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی'' اس مسلمان قوم کا تجزیہ کیا گیا تھا' اسی قدر اطمینان کے ساتھ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دور ثانی میں اس پوری قوم کو ''مسلمان'' فرض کر کے استدلال کی بنا رکھی گئی۔ اس پورے دورِ ثانی میں آپ کو

''ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں' ان کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں''

کی قسم کی ایک بات بھی نہ ملے گی۔ یہاں اب پوری شدّت کے ساتھ جو استدلال سامنے آتا ہے' وہ کچھ اس طرح کا ہے ... ''جب ہم مسلمان ہیں تو لازم ہے کہ ہماری حکومت مسلمان ہو'' اور ''چونکہ پاکستان میں غالب اکثریت 'مسلمانوں' کی ہے' لہٰذا لازم ہے کہ یہاں اسلامی دستور نافذ کیا جائے''۔ اب اصل زور (emphasis) اس بات پر نہ رہا کہ مسلمانوں کے عقائد' ان کے افکار' ان کے کردار اور ان کے اخلاق کا تجزیہ کر کے اس میں اسلامی اور غیر اسلامی آمیزش کو واضح کیا جاتا اور مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بننے کی تلقین کی جاتی' بلکہ اصل زور اس بات پر صرف کیا جانے لگا کہ ''جب ہم مسلمان ہیں'' -----تو لازم ہے کہ ہماری ریاست اور حکومت کا اوپر کا ڈھانچہ اسلام کے مطابق تبدیل کر دیا جائے۔

مسلمانوں کا اسلام کے ساتھ لگاؤ جس کی حیثیت اس سے قبل صرف ان کے ایک ''آبائی مذہب'' ہونے کے ساتھ ان کے جذباتی لگاؤ کی سمجھی جاتی تھی' اب اس طرح پیش کیا جانے لگا گویا کہ یہ قوم اسلام ہی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا چاہتی ہے اور اس کی دلی خواہش ہے کہ اس کے تمام امور' خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں خواہ اجتماعی سے' اسلام ہی کی منشا کے مطابق طے پائیں۔ ملاحظہ ہو:

''دوسری صورت یہ ہے کہ ہم انفرادی اور قومی زندگی کے لیے اس راہ کا انتخاب کر لیں' جو قرآن و سُنّت محمد ﷺ نے ہم کو دکھائی ہے۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلم آبادی کے کم از کم ۹۹۹ فی ہزار باشندے چاہتے ہیں...'' (مسلمانوں کا ماضی و حال اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل)

''مطالبۂ نظامِ اسلامی'' کے مقدّمات میں کہا گیا:

''یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی جگہ مسلم ہو لیکن جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔''

گویا کہ اس قوم کے ایک ایک فرد کا ''مسلم'' ہونا بطور اصل موضوعہ کے تسلیم! اور اس چیز کی لَے یہاں تک بڑھی کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب جماعت اور اس کے اکابرین کو پورے ماحول میں خرابی بس صرف ایک ''برسر اقتدار طبقہ'' میں نظر آتی تھی۔ خرابیوں اور برائیوں کا مجسمہ اگر تھے تو بس صرف اس طبقہ کے لوگ --- - رہی باقی مسلمان قوم تو اس کے دل میں تو گویا مؤمنانہ اور مسلمانہ جذبات موجزن تھے اور یہ آرزو جاگزیں تھی کہ کسی طرح پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ وہ ''انفرادی اور نجی'' اعتبار سے تو مسلمان تھی ہی' اب کسر صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ اس کی حکومت کے ماحول اور اس کے نظامِ حکومت و سیاست اور دستور و قانون کو اسلام کے مطابق بدل دیا جائے۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

اگرچہ مسلمانِ عوام کی اخلاقی و دینی پستی پر اس کے بعد کے دور میں بھی تنقید ہوتی رہی اور ان کے مختلف طبقات کی خامیوں کو گنوایا جاتا رہا لیکن اصل سوال emphasis کا ہے اور وہ اب بجائے اس کے کہ ''مسلمانو! تم حقیقت اسلام سے دور ہو' اس بعد کو ختم کرو!'' اس پر تھا کہ ''جب ہم مسلمان ہیں تو چاہیے کہ ہماری حکومت بھی مسلمان ہو --- !''

غیر مسلموں سے اپیل کا خاتمہ

ساتھ ہی اس تحریک کی اپیل اور دعوت غیر مسلموں کے لیے ختم ہو گئی۔ بعد تقسیم کے پورے لٹریچر میں آپ کو سرے سے یہ بات کہیں نہ ملے گی کہ یہ ایک بین الاقوامی تحریک

ہے' جس کا تخاطب مسلمانوں اور غیر مسلموں سب سے ہے! دورِ اوّل ہی کے کچھ سکہ بند فقرے جن کو ادا کرنے کی زبانیں چھ سات سال کے عرصہ میں عادی ہو گئی تھیں' عادتاً تو کہیں کہیں ضرور دہرائے ہوئے ملتے ہیں لیکن ایک تحریک کی حیثیت سے دعوت کی اپیل اب صرف مسلمانوں سے رہ گئی تھی (بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ دعوت تو مسلمانوں کو بھی نہ تھی' اب تو تمام تر خطاب ''برسرِ اقتدار گروہ'' سے تھا)۔

اب غیر مسلموں کے لیے کسی اتمامِ حُجّت کی سرے سے ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں جوں کے توں

''کافر'' تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پہلے انگریزوں' پارسیوں' ہندوئوں اور سکھوں تک کو کافر کہنا (باعتبار حقیقت' نہ کہ باعتبار قانون) صحیح نہ تھا اور اب ان لوگوں کی تکفیر کے لیے بھی سعی و جہد میں باقاعدہ حصّہ لیا گیا کہ جو کم از کم اہل قبلہ تھے اور جن کو خود اپنے اسلام پر اصرار تھا۔

اینٹی قادیانی تحریک میں جماعت اسلامی کا حصّہ اس دورِ ثانی کی خصوصیات کا ایک مکمل مجموعہ ہونے کے اعتبار سے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے' لہٰذا اس پر مفصل گفتگو تو بعد میں ہو گی ----- یہاں صرف اس قدر وضاحت مطلوب ہے کہ دورِ اوّل میں جماعت اسلامی اتمامِ حُجّت سے قبل ''انگریزوں' سکھوں' ہندوئوں اور پارسیوں'' تک کو کافر کہنے میں احتیاط کرتی تھی لیکن دورِ ثانی میں اس کا مزاج اور مذاق بالکل عوامی سطح پر آگیا۔

قومی جماعت

جس طرح دورِ اوّل کی جماعت اسلامی کی خصوصیات اوّل و دوم نے اسے بالکل ''اصولی اسلامی تحریک'' کی حیثیت دی تھی' اسی طرح دورِ ثانی کی مندرجہ بالا خصوصیات اوّل و دوم نے اس دور کی جماعت کو بالکل ایک ''قومی جماعت'' کی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا۔ وہی لفظ قوم جو پہلے اس لیے متروک ہو گیا تھا کہ چاہے اپنی اصل کے اعتبار سے اس میں فی الواقع کوئی قباحت نہ ہو' لیکن اس کے ساتھ عرصۂ دراز کے استعمال سے غیر اسلامی تصوات لازماً وابستہ ہو گئے تھے (بلکہ مولانا نے تو ثابت کیا تھا کہ یہ لفظ کسی

طرح بھی خالص اسلامی ہیئت اجتماعی کے لیے نہیں بولا جا سکتا۔ اس کے لیے تو جماعت' حزب اور امت ہی کے تین الفاظ ہیں) (۱۶) اب بکثرت اور پورے اطمینان کے ساتھ تقریروں اور تحریروں میں استعمال ہونے لگا۔

اس دور کی ''خشت اوّل'' کی حیثیت رکھنے والی تقریر ''مطالبہ نظام اسلامی'' کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

''حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گزر رہے ہیں' ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوئے ہیں' ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بحیثیت قوم ہم کریں گے' وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔''

اور اس کے بعد جس اطمینان کے ساتھ تحریروں اور تقریروں میں ہمارے قومی مسائل' ہمارے قومی رجحانات' ہماری قومی خواہش' ہمارے قومی جذبات' ہماری قومی روایات' ہماری قومی تہذیب اور ہمارے قومی تمدن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں' ان کو جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل میں جانا لاحاصل ہے۔ البتہ اس موقع پر ایک اقتباس دیے بغیر گزر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ ملاحظہ ہو ''اشارات'' ترجمان القرآن اگست ۱۹۴۸ء کا پہلا پیراگراف:

''مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں' ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے ... یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے' جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل رکھا جائے ... بہر حال قوم کی خیر خواہی کا اس میں شائبہ بھی نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے ...''
گویا کہ مسلمانوں کے قومی کاز کی چیمپئن اب جماعت اسلامی تھی۔ ع ''کہ ہم نے انقلابِ

_____(۱۶) ملاحظہ ہوں اقتباسات مندرج بر صفحہ ۵۷-۵۸

چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!'' پھر اگلے ماہ کے ''ترجمان'' کے اشارات کا اٹھان ملاحظہ ہو:
''اس مہینے مسلمانوں کو دو ایسے زبردست حادثے پیش آئے ہیں جنہوں نے ان کی قومی زندگی کو صدمۂ عظیم پہنچایا ہے۔''
اس موقع پر ذرا اوراق اُلٹ کر دورِ اوّل کی تحریروں کے وہ اقتباس ملاحظہ فرما لیجیے جو ص ۵۶ سے ص۵۸ تک درج ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو بیک وقت دیکھنے سے پوری طرح اندازہ ہو گا کہ یہ فرق اور امتیاز صرف لفظی نہیں ہے' بلکہ اس سے پوری تحریک کی نوعیت میں کس قدر عظیم الشان فرق واقع ہو گیا ہے۔ جس تحریک کی ابتدا خالص اسلامی اور اصولی تحریک کی حیثیت سے ہوئی ہو' اس کا اس طرح ایک قومی جماعت میں تبدیل ہو جانا معمولی فرق نہیں بلکہ بنیادی تبدیلی ہے۔

نصب العین

جماعت اسلامی کا نصب العین اگرچہ اس دورِ ثانی میں بھی وہی رہا جو دورِ اوّل میں تھا لیکن یہ کہنا کسی طرح صحیح نہ ہو گا کہ اس تبدیلی سے نصب العین بالکل متاثر نہیں ہوا۔ اگرچہ آج بھی جماعت کے دستور میں نصب العین کی دفعہ کے تحت تقریباً وہی الفاظ مرقوم ہیں جو دورِ اوّل میں تھے لیکن تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ الفاظ جوں کے توں رہے ہیں لیکن ان کے مفہوم میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ یہی مسلمان کا لفظ آج سے ہزار بارہ سو سال قبل اپنے اندر جو مفہوم رکھتا تھا' کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی اس کے باوجود کہ یہ لفظ سی طرح بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے ... تاہم نصب العین کے مفہوم میں تبدیلی ایسی بنیادی اور نمایاں نہیں بلکہ خفی اور دوسری تبدیلیوں کی نسبت کسی قدر کم ہے۔
جماعت اسلامی کا نصب العین فی الحقیقت دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک دنیا میں جماعت کی سعی و جُہد کا مقصود--- -- اقامت ِدین' اور دوسرے جماعت کے کارکنوں کو اس سے فی الواقع مطلوب ----- رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی۔

یہ دونوں باتیں جہاں تک ان کے الفاظ کا تعلق ہے' جماعت کے کارکنوں کو ازبر ہیں اور اگر آپ کسی سے سوال کریں تو وہ بلا توقف و تاخیر فوراً یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے بیان کر دے گا' لیکن ہر صاحب ِنظر شخص جسے جماعت کے اندر عملاً کام کرنے اور اس کے کارکنوں کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہو اور جو ذرا حقیقت بینی کے ساتھ سطح سے ذرا نیچے اتر کر جائزہ لے' اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہ رہے گی کہ رفتہ رفتہ یہ الفاظ اپنی معنویت کھوتے چلے جا رہے ہیں اور اس نصب العین کے حقیقی نقوش جماعت کے کارکنوں کے دل و دماغ میں پھیکے پڑتے چلے جا رہے ہیں اور دوسری تبدیلیوں کے ساتھ ایسا ہونا بالکل فطری اور ناگزیر بھی تھا۔

خصوصاً نصب العین کے دوسرے جزو کے بارے میں تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی اتنی ''پاکیزگی'' بھی اب قطعاً موجود نہیں ہے جو دورِ اوّل میں تھی اور اس میں کہیں کم اور کہیں زیادہ کچھ اور چیزوں کی آمیزش اور ملاوٹ ہو گئی ہے اور جوں جوں یہ دَور گزرتا جا رہا ہے' اس آمیزش میں ''اخروی نجات'' کا تناسب کم اور ''دوسری چیزوں'' کا تناسب زیادہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے کہ جسے میں ناقابلِ تردید شہادتوں اور ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کر سکوں' البتہ یہ میرا ایک گہرا احساس ہے جو جماعت کے کارکنوں کے براہِ راست مطالعے اور ان کے ''محرکاتِ عمل'' کے بدقّت تجزیے سے قائم ہوا ہے' اور مَیں جماعت کے اربابِ فکر و نظر میں سے ان لوگوں کو کہ جنہیں جماعت کے کارکنوں کی صفوں میں شریک ہو کر عملاً کام کرنے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کو دیکھنے کا موقع ملا ہے' دعوت دیتا ہوں کہ وہ ذیل کی کسوٹی لے کر جماعت کے کارکنوں کے محرکاتِ عمل کا جائزہ لیں اور پھر خود سوچیں کہ اب ہمارے اصل نصب العین میں ''زرِ خالص'' کے ساتھ ''کھوٹ'' کس تناسب سے شامل ہو چکا ہے۔ ''اور اگر خوش قسمتی سے پیروی ٔ اسلام' اعلائے کلمۃ الحق اور اقامت ِدین کے عزائم کی توفیق مل چکی ہے تو غور کر کے اندازہ لگانا چاہیے کہ کہیں ان عزائم کی تہ میں مسلم

قومیت کا جذبہ تو نہیں کام کر رہا ہے۔ کوئی شوق انجمن سازی' کوئی آرزوئے ناموری' کوئی ہوس روشناسی' کوئی فریب اقتدار طلبی' ان نعروں کا محرک تو نہیں ہے؟ اسی طرح کہیں اس مقدس فرض کو محض اس بنیاد پر تو بجا لانے کا عزم نہیں ہے کہ موجودہ عالمگیر معاشی کشمکش اور عمرانی اضطراب اور سیاسی اختلال کے ہنگاموں میں اسلام کا نظام سیاست و معیشت ہی ان ساری گتھیوں کا ایک موزوں حل نظر آرہا ہے؟'' (''اساسِ دین کی تعمیر'' ... مولانا صدر الدین اصلاحی)

اس معاملے میں کچھ خامی' میں جماعت کے دورِ اوّل میں بھی پاتا ہوں اور اس کا تذکرہ' میں آئندہ ایک

مستقل بحث میں کروں گا۔ لیکن یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس دورِ ثانی میں تو یہ بات اس قدر واضح اور ظاہر و باہر ہے کہ جو اسے محسوس نہ کر سکے اسے یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اس کی قوتِ احساس و ادراک میں کوئی نقص و خامی موجود ہے !

عملی جدّوجُہد

اپنے نصب العین یعنی اقامت ِدین کے لیے طریق کار کے سلسلے میں جو وضاحتیں مثبت اور منفی طور پر دورِ اوّل میں کی گئی تھیں ان کا خلاصہ گزشتہ صفحات میں دیا جا چکا ہے۔ اس پر دوبارہ ایک سرسری نظر ڈال کر اب دورِ ثانی کے طریق کار کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ: ع

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

جو باتیں وہاں بالکل غلط ٹھہرائی گئی تھیں انہیں یہاں باقاعدہ اختیار کیا گیا۔ جن ذرائع سے ''اسلامی حکومت کا قیام'' نا ممکن العمل بتایا گیا تھا' انہی پر یہاں طبع آزمائی کی گئی تھی اور جس راستے کے اختیار کرنے پر مسلم لیگ کی تنقیص کی گئی تھی ٹھیک اسی راستے پر جماعت اسلامی نے پیش قدمی شروع کر دی۔ دورِ اوّل اور دورِ ثانی کے مابین ''طریق کار'' کا یہ اختلاف بلکہ تضاد اتنا واضح ہے کہ در حقیقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ آج موجودہ طریق کار کے لیے خوشنما دلائل پیش کیے جا رہے ہیں لہٰذا ... اوّلاً اس تضاد کو واضح کرنے ... اور ثانیاً ان دلائل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے !

دو نکاتی پروگرام

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا وہ اوّل روز ہی سے دو نکات پر مشتمل تھا:

(۱) اس ملک کے دستور کو اسلام کے اصولوں کے مطابق بنوانے کی سعی کی جائے اور اس کے لیے رائے عامہ کو منظم کر کے جدّوجُہد شروع کی جائے۔

(۲)یہاں کی قیادت میں انقلاب برپا کیا جائے۔

ان دو نکات کو میں نے محض وضاحت کی غرض سے علیحدہ بیان کر دیا ہے ورنہ ان دونوں نکات پر کام بیک وقت شروع ہو گیا تھا اور یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے تھے (بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلے نکتے کی سعی و جہد کو بھی دوسرے کے لیے استعمال کیا گیا)۔

دونوں نکات کی نظری ابتدا قبل از تقسیم

ان دونوں نکات پر سعی و جُہد شرع کرنے کے عزائم کا اظہار اوائل ۱۹۴۷ء کی تقاریر ہی میں کر دیا گیا تھا (یعنی تقسیم سے متصلاً قبل)۔

* نکتہ اوّل کے بارے میں اجتماع دار الاسلام منعقدہ مئی ۱۹۴۷ء کے موقع پر ایک تقریر میں صاف وضاحت ملتی ہے:

''اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصّہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہو گا۔ پہلے حصّہ میں ہم کوشش کریں گے رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔''

(''جماعت اسلامی کی دعوت'' شائع شدہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء)

* اور نکتہ ثانی کے لیے ملاحظہ ہو تقریر ''ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل'' سے ایک اقتباس:

''جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا

... اس کی وجہ سے ہندوئوں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور ان کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی ... جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویے اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظاموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو جائے گا ... آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت مہمل ہو جائیں گے۔ آج کے خیالات اور تصوّرات کے لیے اس وقت کوئی جگہ نہ ہو گی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھ جائیں گی۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ آج جو لوگ انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصل سبب سمجھنے لگیں !''

قرائن بتاتے ہیں کہ ''قیادت'' میں اس ''خلا'' کی توقع ہی نے اُس وقت دل میں اس بات کے امکانات روشن کیے تھے کہ تقسیم کے بعد ''انقلابِ قیادت'' کی مہم کو ایک ہی ہلے میں سر کیا جائے گا !
دونوں نکات پر کام کی عملی ابتدا بعد از تقسیم
تقسیم کے عملاً واقع ہو جانے کے بعد ----- حوادثِ تقسیم کے اثرت کے ذرا دور ہوجانے پر ان دونونکات پر عملاً جدّوجُہد کا آغاز کر دیا گیا۔

= ایک طرف

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لاء کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب نے ریاست پاکستان کو مسلمان بنانے کے لیے تجویز کیا کہ ''ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ:

۱) پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

۲) ریاست کا اساسی قانون شریعت خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہمیں پہنچی ہے۔

تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا جو شریعت سے متصادم ہو۔

۴) ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہو گی۔''

اور اس کے بعد اس تجویز کے کچھ الفاظ تبدیل کر کے اسے ایک باقاعدہ ''مطالبہ'' کی شکل دے دی گئی جو حسب ذیل ہے:

دستور ساز اسمبلی سے مسلمانانِ پاکستان کا مطالبہ

چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور

چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدّوجُہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں

لھٰذا

اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی اس کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳) تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں' منسوخ کیے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

۴) حکومتِ پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت

نے مقرر کر دیے ہیں۔''

اس کے فوراً بعد اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں ہی مغربی پاکستان کا ایک مفصل دورہ کرکے مولانا مودودی صاحب نے لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعت اسلامی کے زیر اہتمام جلسہ ہائے عام منعقد کرا کے اس مضمون پر مشتمل تقاریر فرمائیں جو بعد میں ''مطالبہ نظام اسلامی'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان تقاریر میں مولانا نے مطالبہ نظام اسلامی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور اس کو ان دو امور پر مبنی قرار دیا کہ:

- اوّلاً جب ہم مسلمان ہیں تو ہماری حکومت کو بھی مسلمان ہی ہونا چاہیے اور

- ثانیاً یہ کہ ''ہمارے مطالبہ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بحیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطہ زمین ایسا ملنا چاہیے... الخ''

* پھر اس کے لیے ایک اور جذباتی اپیل یہ کی کہ----- تقسیم ہند نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصے میں تو اسلام کا مستقبل تاریک کر ہی دیا ہے، اب رہ گیا وہ قلیل علاقہ جس پر پاکستان مشتمل ہے تو یہاں بھی اگر اسلامی نظام قائم نہ ہوا تو گویا یہ اس پورے برصغیر سے اسلام کا خاتمہ ہو گا۔

* اور اسے مطالبے کی صورت میں پیش کرنے کی وجوہات یہ بیان کیں کہ:

- ''اوّلاً یہاں ایک مصنوعی انقلاب برپا ہوا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوا ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت پیش نہ آتی بلکہ انقلاب کے فوراً بعد آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوجاتی۔''

- دوسرے اس لیے بھی کہ ''جن لوگوں کے ہاتھ میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں (۱۷) وہ متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر یہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ کیا جائے' کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ قائم کیا جائے گا۔

_____(۱۷) ''ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں'' لائقِ توجّہ ہے۔

کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا نہ مسلمان مسلمان' بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا ہم معنی ہے اور کبھی ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ اسلامی سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی یہ اسلامی جمہوریت کا چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ لوگ جس معنی میں اسلامی نظام کے خواہش مند ہیں آپ اسی معنی میں اسے قائم کریں۔ آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔''

*تیسرے یہ کہ

''ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات دیے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو اسی خلاف اسلام طریق پر استعمال کر رہے ہیں جو قوم کو اسلام سے ہٹا کر غیر اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر فی الواقع عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنہوں نے مغربی اصولوں کو اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنا یہ خود بگڑے ہیں اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ ان اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیے ہیں۔ اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔''

٭آخر میں گزارش اور اپیل کی کہ:

''آپ حضرات سے گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کے دل اسلامی نظام کے مطالبے پر مطمئن ہوں تو پھر اس کو باقاعدہ طور پر اپنا قومی مطالبہ بنایئے اور اس کے پلڑے میں اپنا پورا وزن ڈالیے۔''

- اور دوسری طرف

قیادت میں جس ''خلا'' کے رونما ہونے کی پہلے سے توقع تھی اسی کے احساس کو اجاگر کرنے اور ایک نئی ''قیادت'' کی ضرورت کا احساس شدّت کے ساتھ بیدار کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

اس سلسلے میں ''ترجمان القرآن'' کے ان پرچوں کے اشارات کا مطالعہ بے حد مفید ہے کہ جو قیام پاکستان کے بعد رسالے کے از سرِ نو اجراء کے بعد تین چار ماہ تک شائع ہوئے۔ میری مراد جون ۱۹۴۸ء سے ستمبر ۱۹۴۸ء تک کے چار پرچوں سے ہے۔ (اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مولانا مع اپنے دو رفقائے کار گرفتار کر لیے گئے تھے)

- پہلے پرچے میں جو جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا' مولانا مودودی صاحب نے:

(۱) سب سے پہلے تقسیم کے وقت کے حوادث اور ہنگاموں کا تذکرہ کیا اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کی ذمہ داری برصغیر کی مختلف قوموں کے ''قومی راہنمائوں'' پر عائد کی۔

''ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بَری نہیں ہو سکتے جو اس دور میں یہاں کی مختلف قوموں کے راہنما اور سربراہ رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں' دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی پیشوائی کی ... اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے۔ ایسے اناڑی اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ کھیل کھیلا تو درحقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں۔ ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیے۔''

(۲) پھر ایک نظر ''تقسیم کے ڈرامے'' پر ڈالی اور اس کے اصل تین کرداروں یعنی انگریز' کانگریس اور مسلم لیگ کے کام کا جائزہ لیا اور سب سے آخر میں مسلم لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔ دس سال سے مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبد الحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دولِ یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے ... اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں انہوں نے خود اپنی قوم کی اخلاقی' مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبے کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی ! ...''

... ''اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جا سکے لیکن اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ...''

* دوسرے پرچے میں جو جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا' مولانا نے مسلم ہندوستان کی گزشتہ دس گیارہ برس کی تاریخ کا خلاصہ بیان کیا کہ کس طرح ''ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگریس کو برسر اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے کا پروگرام سن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے'' -----پھر کس طرح اس مسئلے پر مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ جن میں سے ایک گروہ کا کہنا تھا کہ ''خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے' سب تمہارا وہم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈراوا ہے'' -----اور دوسرے کا کہنا تھا کہ ''خطرہ واقعی اور حقیقی ہے اور یہ سیلاب آزادی وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو امپریلزم کا سیلاب ہے''-----پھر کس طرح اس مؤخر الذکر گروہ میں بھی دو رائیں پیدا ہو گئیں: ایک یہ کہ ''مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں''۔ اور دوسری یہ کہ ''تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں ... جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں

ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے''۔ پھر کس طرح مسلم عوام کی غالب اکثریت نے اس دوسری رائے کو قبول کیا اور اس کے تحت ایک قومی جنگ لڑی۔ اس کے بعد مولانا مودودی اس قومی تحریک کی قیادت کی غلطیوں کو ایک ایک کر کے گنواتے ہیں اور آخر میں ٹیپ کا بند ارشاد ہوتا ہے کہ:

''جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو امٹ ہے' اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی' ہے... !''

* تیسرے پرچے میں جو اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا' مولانا نے ان بڑے بڑے مسائل کا جائزہ لیا جن سے مسلمان اس وقت ''بحیثیت ایک قوم کے'' دوچار تھے ' اور ان کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد عوام کو بتایا کہ وہ اپنی موجودہ قیادت کا جائزہ اس اعتبار سے لیں کہ اس کے اندر ان مسائل کو حل کرنے کی کس قدر اہلیت موجود ہے:

''اور قیادت کا اصل محک ِ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں حل کرنے کی اہلیت فکری اور اخلاقی اعتبار سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے !''

* چوتھے پرچے میں جو ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا' مولانا نے ''دو ایسے زبردست حادثوں'' کا ذکر کیا جو اس مہینے مسلمانوں کو پیش آئے اور جنہوں نے ان کی قومی زندگی کو ایک صدمہ عظیم پہنچایا تھا۔

(۱) ''پہلا حادثہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی مرحوم کی وفات کا'' جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے جب یہ لکھا کہ:

''بے وقت موت ایک ملحدانہ اصطلاح ہے۔ مسلمان کے نزدیک ہر موت اپنے ٹھیک وقت پر آتی ہے اور خدا اس کا وقت کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ اپنی حکمت اور مصلحت کے اعتبار سے مقرر کرتا ہے ...''

تو غالباً مولانا کے پیش نظر اس حادثے کی یہ مصلحت اور حکمت تھی کہ مسلمانوں کی

قیادتِ عظمیٰ کے اس ستون کے گر جانے کے بعد انقلابِ قیادت کا کام پہلے سے آسان ہوجائے گا۔

(۲) دوسرا زبردست حادثہ جو ''قوم کو پیش آیا'' وہ سقوطِ حیدر آباد تھا۔ اس پر بھی مولانا نے سیر حاصل تبصرہ کیا ----- اور آخر میں قوم کو یہ پتے کی بات بتائی کہ:

''آج اس جمہوریت کے دور میں عوام کا وہی مقام ہے جو پہلے بادشاہوں کو حاصل تھا ----- اقتدار اور اختیار کا منبع اب بادشاہ نہیں بلکہ ملک کے عوام ہیں۔ زندگی کا سارا نظام اسی وقت درست رہ سکتا ہے جب کہ عوام الناس کا شعور درست ہو' ان میں برے اور بھلے کی تمیز ہو اور وہ ٹھیک ٹھیک سمجھیں کہ کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے !''

اس طرح مولانا نے ''انقلابِ قیادت'' کے لیے فضا کو ہموار کرنا شروع کیا۔ یوں ان دونوں نکات پر عملی جدّوجُہد شروع ہو گئی ----- اور دورِ ثانی کے اس طریق کار کی بنیاد عملاً رکھ دی گئی جس پر جماعت اسلامی تا امروز عمل پیرا ہے !

تضاد کیوں محسوس نہ ہوا؟

دورِ اوّل اور دورِ ثانی کے طریق کار میں اصولی فرق اور تفاوت -------- بلکہ تضاد اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اوّل تو جن لوگوں کے ہاتھوں دورِ اوّل کے طریق کار کی نیو رکھی گئی آخر کیسے ممکن ہوا کہ وہ دورِ ثانی میں بالکل مخالف سمت میں چل کھڑے ہوئے' اور ثانیاً یہ کہ جو لوگ دورِ اوّل کی دعوت سے کھنچ کر آئے تھے

اور جن کے ذہن و دماغ کو دورِ اوّل کی تحریروں نے ایک خاص طرز پر ڈھال دیا تھا آخر وہ کیسے دورِ ثانی میں بالکل مختلف طرز کی تحریک میں fit ہو گئے !

جہاں تک اس ''استفہام استعجابی'' کے پہلے جزو کا تعلق ہے اس سے تو میں بعد میں ایک مستقل باب میں بحث کروں گا لیکن جہاں تک اس کے دوسرے جزو کا تعلق ہے اس کے بارے میں چند معروضات اسی وقت مناسب خیال کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تبدیلی اصولاً تو اگرچہ ایک دم آگئی تھی لیکن اس کے مطابق جماعت کے

تفصیلی نقشے کو بدلتے ہوئے ذرا دیر لگی اور ''مقتدیوں'' میں سے بہت ہی کم لوگ اتنی اونچی ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں جو ایک باریک سے اصولی فرق کو محسوس کرسکیں۔ وہ اس فرق کو اسی وقت محسوس کر پاتے ہیں جب کہ وہ ایک اصولی تبدیلی عملی اثرات پیدا کر چکے اور آج جبکہ طریق کار کی یہ تبدیلی پوری طرح برگ و بار لا چکی ہے' جماعت کے اندر اکثر لوگ کم از کم یہ ضرور محسوس کر رہے ہیں کہ ''اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی'' اور ''کچھ نہ کچھ ہم بدلے ضرور ہیں۔'' (۱۸) یہ دوسری بات ہے کہ ان کی اکثریت ابھی تک اس تبدیلی کا تجزیہ نہیں کر پائی ہے اور انگلی رکھ کر نہیں بتا پائی کہ ٹیڑھ یہاں واقع ہوئی ہے۔ دوسری یہ بات ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ایک وقت میں عوام ایک ہی بات سوچ پاتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حال کے ساتھ ساتھ ماضی اور مستقبل پر بھی نگاہ رکھ سکیں ... کسی تحریک کے دو ادوار کا فرق صرف اسی وقت نگاہوں کے سامنے آسکتا ہے جب کہ اس کے دونوں ادوار کا تقابلی مطالعہ یک وقت کیا جائے۔ یہاں یہ صورت ہوئی کہ جب پہلا دور تھا تو اس میں مگن تھے اور پوری طرح مطمئن۔ اور جب دوسرا دور آیا تو اس میں اُلجھ گئے اور اگر دل میں کبھی کوئی کھٹک پیدا بھی ہوئی تو اسے وقت کی ہنگامی مصروفیتوں نے دبا دیا اور اس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ اس پر سوچ بچار کر کے کوئی رائے قائم کی جا سکے۔

بہر حال اب جب کہ یہ دونوں ادوار یک وقت سامنے رکھ دیے گئے ہیں ان کا آپس میں فرق و تفاوت بالکل نمایاں اور واضح ہے۔ آئیے ذرا دونوں نکات کا جائزہ لیں !

---

(۱۸) اور یہی وہ عمومی احساس تھا جو جماعت اسلامی کے اراکین اور کارکنان کی ایک بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا تھا جس نے نومبر ۱۹۵۵ء کے آل پاکستان اجتماع کے موقع پر اتنی شدّت اختیار کی کہ جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کو اس کے اسباب کا سراغ لگانے کے لیے ''جائزہ کمیٹی'' تشکیل کرنا پڑی۔

نکتہ اوّل میں تضاد

* دورِ اوّل میں پوری شدّت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ ''اسلامی حکومت'' کے قیام کا بس ایک ہی راستہ ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں اقتباسات مندرجہ بر ص ٦٢ - ٧٣ تحریر ہذا) لیکن اب پورے اطمینان سے کہہ دیا گیا کہ:
''واضح طور پر جان لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے... ! '' (رسائل و مسائل' مولانا مودودی)

اور پھر جس طریقے کو واحد ممکن طریقے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا یعنی یہ کہ ''معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور اور ارادے کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے''... اسے اب ایک طریقے کی حیثیت سے تسلیم کر کے ترک کر دیا گیا اور اُس طریقے کو اپنا لیا گیا جس کے بارے میں بالوضاحت کہا گیا تھا کہ اس سے اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں ہے۔
* دورِ اوّل میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تحریک مسلم لیگ اپنی نوعیت اور طریق کار سے صرف ایک قومی سٹیٹ وجود میں لا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کا اس کے ذریعے قائم ہو جانا بالکل ایسے ہے جیسے نیم کے بیج سے آم کے درخت کا اُگ آنا۔

لیکن اب زوردار دلائل کے ساتھ ثابت کیا جانے لگا کہ تحریک پاکستان کا عین تقاضا یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو اور اس میں ایک ٹھیٹھ اسلامی ریاست قائم ہو! کہا گیا کہ تحریک پاکستان کا منطقی نتیجہ ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیے۔ یہ خواب دیکھے جانے لگے کہ تحریک پاکستان ہی کو اس کے منطقی نتائج پر پہنچا کر اسلامی نظام کو وجود میں لایا جا سکتا ہے۔
1پہلے واضح طور پر اعلان کیا گیا تھا کہ قیام پاکستان کے بعد بھی ہم مجبور ہوں گے کہ اپنے اسی فطری طریق کار پر کام کرتے چلے جائیں۔ مسلمانوں کے ایک قومی سٹیٹ کے

عالم وجود میں آجانے سے ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام میں کسی آسانی کی توقع نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ جب ہمیںپھر بھی آج ہی کی طرح تحریک چلانی ہو گی تو کیوں نہ ابھی سے اپنے طریق کار کے مطابق کام شروع کر دیں۔ ایک

لا حاصل کام کے لیے ہم اپنی منزل کھوٹی کیوں کریں۔ (ملاحظہ ہو اقتباس مندرجہ بر ص ٦٧ تحریر ہذا)
لیکن اب ----- اپنے آپ کو اصولاً تحریک پاکستان میں فٹ کر لیا گیا' اور ----- امید باندھی گئی کہ قیام پاکستان کے ذریعے:
''اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔''
(ملاحظہ ہو :قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)
* کہا گیا تھا -----''وہ قومی حکومت جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہو گا' اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے... غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان کی سزا پھانسی اور جلا وطنی سے دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔''
لیکن اب امیدیں باندھی گئیں کہ:
''جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظامِ تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں...''
اگر یہ بھی ''تضاد'' نہیں ہے تو فرمایا جائے کہ تضاد اور کس چیز کا نام ہے!
ذرا ایک نظر ''ریڈیو پاکستان'' سے نشر شدہ اس مباحثے پر بھی ڈال لیجیے جو ریاست پاکستان کی آئندہ نوعیت پر مولانا مودودی صاحب اور جناب وجیہ الدین صاحب کے درمیان ہوا۔ اس مباحثے میں سائل (جناب وجیہ الدین) کا سوال ملاحظہ ہو!

س: ''میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج' اخلاق' عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا پرتو نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہو گی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس اندازِ فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اس طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصل اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ تعداد مضبوط ہو جائے گی اور قومی کیریکٹر میں اسلامی تصوّرات پوری طرح سرایت کر جائیں گے' اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کر لے گا۔ میری

نظر میں وہ وقت ابھی دور ہے جب ہم ملکی طرز پر اسلامی تصوّرات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔''

صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں جناب سائل بالکل اسی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ جو خود جماعت اسلامی نے اپنے دور اوّل میں پیدا کی تھی۔ ٹھیک وہی نقطۂ نظر جو کسی ملک کے سیاسی نظام اور اس کی حکومت کی ہیئت کے بارے میں خود مولانا مودودی صاحب نے ایک طویل عرصے تک پیش فرمایا تھا' جب ان کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کا جواب تھا:

''آپ نے سچ فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُر زور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو۔ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور' اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے مگر میں نہیں سمجھا کہ اس

کوشش میں حصّہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟ ...''

یہاں مولانا نے اصل بات سے کنی کترا کر بات بنانے کی کوشش فرمائی ہے اور اس مفروضے کے دامن میں پناہ لی ہے جو جلی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ... لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ غلط نہیں تھا۔ اور خود مولانا کے قبل تقسیم کے ارشادات سے بالکل مختلف اور متضاد نہیں تھا!

نکتہ ثانی میں تضاد

* انقلابِ قیادت کے بارے میں پہلا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ''قومی ریاست میں جب تک ووٹروں ہی کے افکار و نظریات و ذہنیت و عقائد بدل نہ دیے جائیں اس وقت تک کسی اصول پسند اور اسلام پرست قیادت کا ان میں سے ابھرنا بالکل نا ممکن ہے''۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اقتباس از ''اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' مندرجہ برص ٦٥ تحریر ہذا)

لیکن ----- اب عوام کی ذہنیت' ان کی پسند اور نا پسند' ان کے خیالات و افکار اور ان کی سیرت و اخلاق میں

انقلاب پیدا کیے بغیر محض اس بات سے کہ انہیں اس وقت کی ''قومی قیادت'' سے بد ظن اور مایوس کر دیا جائے' اس بات کی توقعات وابستہ کی جا رہی تھیں کہ ایک صالح قیادت برپا ہو جائے گی۔

اس معاملے میں دورِ اوّل کے خیالات اور نظریات سے ایک واضح تضاد کے علاوہ ''سادہ لوحی'' اور ''بھولے پن'' کا بھی ایک شاہکار سامنے آتا ہے: کیا واقعی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ''انقلابِ قیادت'' اگر اس کا مطلب قیادت میں کوئی اصولی اور بنیادی تغیر ہے' صرف اس طرح رونما ہو سکتا ہے کہ ایک خاص وقت کی برسرِ اقتدار ٹیم سے عوام کو بد ظن کر دیا جائے۔ یہاں یہ بات تو صحیح طور پر ہی سمجھی گئی تھی کہ تقسیم کے بعد قیادت کے میدان میں اس بنا پر ایک ہلکا سا خلا واقع ہوا تھا کہ اس وقت کی قیادت نے صرف قیام پاکستان تک کے لیے پروگرام اپنی قوم کے سامنے رکھا تھا اور اب جس مقصود کے لیے سعی کی گئی تھی

اس کے حاصل کر لینے کے بعد اس کے پاس قوم کے لیے کوئی خاص پروگرام نہ تھا اور یہ قیادت کرنے والی ٹیم میں افراد کی تبدیلی کے لیے ایک آسان موقع تھا' لیکن کیا بس اسی سے قیادت میں کوئی اصولی تغیر بھی پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جس نے بھی ایسا سمجھا اس نے اپنی سیاسی بے بصیرتی کا کھلا ثبوت فراہم کیا۔ آخر اس وقت انفرادی اور اجتماعی زندگی جس نہج پر گزاری جا رہی تھی اس میں کون سا اصولی اور بنیادی تغیر واقع ہوا تھا؟ کیا لوگوں کے نظریات بدل گئے تھے اور ان کے افکار میں انقلاب آ چکا تھا؟ کیا ان کی پسند اور ناپسند کا معیار اسلام اور صرف اسلام بن چکا تھا؟ کیا انہوں نے اسلام کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات کو تبدیل کر لیا تھا؟ ----- کہ اب اس بات کی توقع کی جاتی کہ ان کی قیادت میں اس طرح کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے کہ ''ایک صالح قیادت'' برسرِ کار آ جائے----- اور اگر ایسی کوئی تبدیلی پورے نظام زندگی میں واقع نہیں ہوئی تھی اور یقیناً بالکل نہیں ہوئی تھی تو پھر انقلابِ قیادت کی توقع بچوں کی سی خام خیالی سے زیادہ اور کیا قرار دی جا سکتی ہے؟

یہ صحیح ہے کہ آپ اس وقت کی قیادت کرنے والی ٹیم پر تنقید کر کے اسے کمزور کر سکتے تھے اور اس میں کلام نہیں کہ عوام کو ان سے بد ظن اور مایوس کیا جا سکتا تھا ----- لیکن یہ بات آپ نے کس طرح سمجھ لی تھی کہ اس طرح قیادت میں صالح انقلاب بھی برپا کیا جا سکتا ہے -----اس تخریب کے بعد کسی تعمیر کی توقع بالکل غلط تھی۔ تخریب آپ کر سکتے تھے اور آپ نے کی' لیکن تعمیر کے سلسلے میں آپ کی توقعات ''سہانے خواب'' سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھیں اور اس کا تجربہ آپ کو بعد کے حالات سے ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور کی ان تحریروں کا مطالعہ کیا جائے جو انقلابِ قیادت کے سلسلے میں خصوصاً نعیم صدیقی صاحب کے قلم سے نکلیں تو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے علمی مرتبے کے لوگ جن کا مطالعہ وسیع اور جن کی نظریں باریک بین اور دُوررس واقع ہوئی ہیں' اس دور میں اس معاملے میں کس طرح کی بچگانہ باتیں کرتے رہے

ہیں ! انقلابِ قیادت کا نعرہ اس طرح بلند کیا گیا اور اس کے لیے اتنے زور سے ہلّہ بولا گیا (اگرچہ یہ سب کچھ تھا صرف ''کاغذی'' دنیا میں ----- یعنی صرف ترجمان القرآن کے

اشارات کے کالموں میں ہی) کہ محسوس ہوتا تھا کہ بس یہ مورچہ تو اب سر ہونے کو ہے اور یہ تبدیل تو اب واقع ہوا چاہتی ہے ! !

اس میں حیرت و استعجاب کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ آخر وہ کون سی قیادت تھی کہ جس کو برسرِ کار لانے کے لیے یہ پاپڑ بیلے جا رہے تھے۔ ملک کے دوسرے سیاسی حلقوں اور طبقوں اور مسلم لیگ کی اس وقت کی قیادت میں تو سرے سے کوئی اصولی اور بنیادی فرق موجود ہی نہ تھا بلکہ دوسرے حلقے ہمارے مطلب کے لحاظ سے مسلم لیگ سے بھی زیادہ ناکارہ تھے ----- تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انقلابِ قیادت سے مراد ان میں سے کسی کی قیادت کا برسر اقتدار آنا ہو----- تو پھر لے دے کر ایک ہی گروہ رہ جاتا ہے یعنی جماعت کا اپنا حلقہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ کیا جماعت کے اکابرین واقعی یہ خیال رکھتے تھے کہ اس وقت ان کے پاس ایک ایسی ٹیم پیدا ہو چکی تھی جو ایک ملک کے کاروبار اور اس کے نظام کو سنبھالنے کے قابل ہو' قطع نظر اس سے کہ اس کے واقعتاً اقتدار تک پہنچنے کے لیے حالات سازگار تھے یا نہ تھے ...مَیں تو اس بات میں بھی شبہ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے بارے میں محض ایک خوش فہمی اور خام خیالی قرار دیتا ہوں کہ جماعت کے پاس اُس دور ہی میں نہیں' آج تک بھی کوئی ایسی ٹیم موجود ہے جو ملک کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

بہر حال ان دونوں نکات کے سلسلے میں یہ وہ واضح تفاوت و تضاد ہے جو دورِ اوّل اور دورِ ثانی کی جماعت اسلامی کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہ وہ ''خام خیالیاں'' ہیں جن میں جماعت کی قیادت کرنے والی ٹیم نے پاکستان بنتے ہی اپنے آپ کو مبتلا کر لیا تھا۔

آغازِ کار

یہاں تک میں نے اس اصولی اور بنیادی تضاد کو واضح کیا ہے جو دور اوّل اور دورِ ثانی کے طریقہ ہائے کار میں پایا جاتا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ذرا جائزہ لے لیا جائے کہ گزشتہ ۹ سالوں (۱۹) میں ان دونوں نکات پر کیا کیا کام ہوا (یہ ہر شخص تسلیم کرے گا کہ

ان ۹ سالوں میں جماعت کی تمام تر مساعی صرف انہی دو کاموں پر صرف ہوئی ہیں۔ علمی انقلاب اور اخلاقی اصلاح کا نام تو ضرور کبھی کبھی لیا گیا ہے لیکن ان دونوں جہتوں میں عملاً کوئی کام نہیں ہو سکا ہے)۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ اس کام کے کیا نتائج ظاہر ہوئے اور اس ۹ سال میں ''ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا'' ! اس

''میزانیۂ نفع و نقصان'' کے ساتھ ان مخمصوں کا تذکرہ بھی آ جائے گا جن میں جماعت اسلامی نے اپنے آپ کو اس غلط طریق کار کی بدولت پھنسا لیا ہے۔ اس پورے جائزے سے معلوم ہو گا کہ اس غلط طریق کار نے ہمیں کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

ساتھ ہی اس سے یہ بھی واضح ہو گا کہ ایک صحیح راہ پر چلنے والے کے لیے '' فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ''اور ایک غلط کار کے لیے ''فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ''کی الٰہی سُنّت کا مظاہرہ عملی دنیا میں کس طرح ہوتا ہے۔

قرار دادِ مقاصد

مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کام کی ابتدا بیک وقت دو نعروں یعنی ''دستورِ اسلام'' اور ''انقلابِ قیادت'' سے کی تھی اور دونوں کے لیے ابتدائی کام بھی خود ہی مکمل کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں مولانا تو گرفتار کر لیے گئے لیکن ''دستورِ اسلامی'' کی یہ مہم زور پکڑتی چلی گئی۔ اس کا مطالبہ عوام کا اپنا مطالبہ بن گیا اور برصغیر پاک و ہند کے دور جدید کی تاریخ میں غالباً پہلی مرتبہ مسلمان رائے عامہ نے اپنا مظاہرہ اس قوت کے ساتھ کیا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بالآخر ۱۲ ، مارچ کو ''قرارداد مقاصد'' پاس ہو گئی۔

یہ وہ پہلی ''فتح'' ہے جو پاکستان میں جماعت اسلامی کو حاصل ہوئی۔ اس کا خوب چرچا کیا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ قرار داد نہ صرف پاکستان کی بلکہ خود جماعت اسلامی کی تاریخ میں ایک بہت بڑے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جدّوجُہد کے

دوران میں جو باتیں کہی گئیں اور اس کے پاس ہونے پر جو ردّ عمل جماعت کی جانب سے ہوا' اس کا تفصیلی جائزہ ضروری ہے۔

* اس کے لیے ''مطالبہ'' کی مہم کے دوران میں ''برسرِ اقتدار گروہ'' کی اس کو ماننے سے پہلو تہی اور قرار دادِ مقاصد کے پاس کرنے میں تعویق و تاخیر کی صرف ایک وجہ بیان کی گئی کہ ----- ''یہ لوگ مغرب پرست ہیں' مغربی افکار و نظریات ان کے ذہنوں میں سرایت کر گئے ہیںاور مغربی طرز کی ریاست اور معاشرے ہی کو یہ پاکستان میں برپا کرنا چاہتے ہیں'' ----- جہاں تک ان باتوں کا تعلق ہے ان سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک دوسری بات کو نظر انداز کر دینا بھی نا انصافی ہے کہ ان کی ہچکچاہٹ کی ایک اور بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جماعت نے صرف دستوری مطالبہ ہی پیش نہ کیا تھا بلکہ ساتھ ہی انقلابِ قیادت کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا اور برسرِ اقتدار گروہ صاف دیکھ رہا تھا کہ اس مطالبے کے منظور کر لینے کا مطلب اسی ''نئی قیادت'' کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا ہو گا۔ اس سلسلے میں میرا مفہوم آپ کے سامنے مزید اس طرح واضح ہو سکے گا کہ آپ اپنے ذہن سے اس معاملے کو نکال کر کسی اور ایسے معاملے کا تصوّر کریں کہ ایک شخص ایک بات کو حق سمجھتا ہے اور اگر عام حالات میں وہ بات اس کے سامنے لائی جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں تأمل نہیں کرتا لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس بات کے تسلیم کرانے سے اس کے پیش کرنے والے کے پیش نظر ''کوئی اور مقصد'' بھی ہے تو فطری طور پر وہ اس حق بات کو قبول کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے اور پس وپیش سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ مَیں اس بات پر تو اصرار نہیں کرتا کہ مسلم لیگی قیادت کی ''مطالبہ'' کے منظور کرنے میں پس وپیش کرنے کی نوعیت بعینہٖ یہی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ----- ایسی بات بھی تھی ضرور!

* پھر اس قرارداد کے پاس ہونے پر اس کا پورا کریڈٹ خود لینے کی کوشش کی گئی اور اسے اپنی ''فتح'' کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔

اوّلاً یہ بات خلافِ واقعہ تھی اور اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جماعت نے واقعتاً اس کام کے سلسلے میں بڑی جدّوجُہد کی تھی اور اس قرارداد کے پاس ہونے میں غالب حصّہ اسی

کی مساعی کا تھا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہونے میں کچھ اور حلقوں کی مساعی کو بھی دخل تھا اور علاّمہ شبیر احمد عثمانی مرحوم اور ان کے رفقاء کی مساعی تو اس معاملے میں فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔

اور ثانیاً اس طرزِبیان نے جماعت اسلامی کو اسلامی نظام -----اور نظامِ اسلامی کو جماعت اسلامی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دے دیا اور اس طرح غریب ''اسلامی نظام'' بین الجماعتی سیاست کا مسئلہ بن کر رہ گیا۔

شاید اسے ''دُور کی کوڑی'' لانا کہا جائے لیکن ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ وہ ذہنیت جس کا مظاہرہ کراچی میں مجلس عمل کے اجلاس میں مولانا محمد علی جالندھری صاحب نے کیا کہ: (۲۰)

''اسلامی دستور اور اسلامی نظام کے ساتھ لوگ جس جماعت کو لازماً مراد لیتے ہیں وہ جماعت اسلامی ہے۔ اگر اس کی جدّوجُہد میں حصّہ لیا جائے تو کریڈٹ سارا جماعت لے جائے گی۔ ہمارے ہاتھ کیا آئے گا!'' (روایت بالمعنیٰ)

جماعت اسلامی کے اپنے اس طرزِبیان ہی سے پیدا ہوئی تھی۔

ثالثاً مسلم لیگی قیادت کے بارے میں یہ بیان کیا گیا کہ یہ قرارداد اس نے پاس نہیں کی بلکہ اس سے کرائی گئی ہے۔ ع

''کہ مَیں آیا نہیں لایا گیا ہوں''

اور اس کے پاس ہونے کو ان کے مقابلے میں اپنی ایک ''فتح مبین'' کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس قرار داد کے پاس کرنے والوں کے بارے میں مولانا مودودی کے ریمارکس ملاحظہ ہوں:

''ان حضرات کے قرار دادِ مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی میم صاحبہ کسی مسلمان نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے اور وہ اپنے اور اپنی اوّلاد کے لیے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق

---

(۲۰) یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب تحریک ختم نبوت کے دوران کراچی میں کل جماعتی مجلس عمل کے اجلاس میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبے کو ''مطالبہ دستور اسلامی'' میں مدغم کر دیا جائے!

حاصل کرنے کے لیے کلمۂ اسلام پڑھ لے۔ لیکن نہ اس کلمے سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی تغیر آئے اور نہ اس کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو۔ جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی ہی میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔''

ذرا نفسیاتی اعتبار سے خود اپنے آپ کو ان لوگوں کی پوزیشن میں رکھ کر سوچیے کہ کیا اس سے چڑ اور جھنجھلاہٹ کا پیدا ہونا فطری بات نہیں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان لوگوں میں اسلامی نظام ... اور قرار داد مقاصد کے بعد دستور اسلامی کے مطالبے سے جو چڑ پیدا ہوئی وہ سراسر اس طرزبیان ہی سے پیدا ہوئی لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس میں اس کو دخل کم وبیش تھا ضرور!

پھر مجھے تو اس ''فتح عظیم'' ہی میں ان تمام مخمصوں اور complications کی بنیاد نظر آتی ہے جن سے جماعت کو بعد میں دوچار ہونا پڑا۔

* اس قرار داد ہی سے ''ریاست پاکستان'' کی نظری اور اصولی حیثیت اور اس کی واقعی اور حقیقی کیفیت کے تضاد کا وہ مخمصہ شروع ہوا جس نے بعد میں جماعت کی راہ میں ایک ایک قدم پر مشکلات پیدا کیں۔

----- حقیقتاً ----- قرار داد سے قبل اور اس کے بعد کے پاکستان میں سر مُو فرق واقع نہ ہوا تھا۔ وہی نظریات و افکار تھے' وہی کردار و اخلاق تھا' وہی دلچسپیاں تھیں' معاشرے کی حالت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا۔ اوپر سے نیچے تک کہیں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ خود مولانا مودودی کے الفاظ میں:

''در حقیقت یہ ایک ایسی بارش تھی کہ نہ جس کے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی پیدا ہوئی۔ اس قرار داد کے پاس ہونے کے دو چار دن پہلے تک بھی اس بات کے کوئی آثار نہیں تھے کہ کوئی واقعہ ہونے والا ہے۔ اس بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوا تک نہیں چلی بلکہ اس کے برس جانے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک حادثہ تھا جو آیا اور گزر گیا۔''

----- لیکن نظری طور پر ----- اس قرار داد نے ریاست پاکستان کو ایک ''اسلامی ریاست'' کا درجہ دے دیا۔ مولانا مودودی نے اس قرار داد مقاصد کا تجزیہ کر کے فرمایا:

''... ان باتوں کی وجہ سے اس اقرار کے وہی معنی ہیں جو لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ محمدٌ رسولُ اللّٰہ کے ہیں۔ پس اس کلمے کے ادا کرنے کی وجہ سے ہماری ریاست اصولی حیثیت سے اسلامی ہو گئی ہے...''

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ''قرار داد مقاصد'' سے پورے کلمۂ طیبہ کا مفہوم اخذ کرنا بھی ایک طویل اور پیچ در پیچ استدلال کے ذریعے ہی ممکن ہوا تھا۔ اس قرار داد کی کُل ''اسلامیت'' یہ چند الفاظ ہیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کُل کائنات کا بلا شرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ

اختیارِ حکمرانی ایک مقدّس امانت ہے۔''

ان میں ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کا مفہوم تو بہر حال از خود موجود ہے لیکن ''مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰہِ'' کا مفہوم اس استدلال سے اخذ کیا گیا ہے کہ جس کے تحت خود ''لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ'' سے بھی اسے اخذ کیا جا سکے۔ غور کا مقام ہے کہ اگر اس استدلال سے کلمۂ طیبہ کے جزوِ ثانی کو اس کے جزوِ اوّل ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے تو اس جزوِ ثانی کے ایک مستقل اور لازمی جز کی حیثیت سے کلمے میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جماعت اسلامی منتظر بیٹھی تھی کہ دستور ساز اسمبلی ذرا ایک بات کر دے' خواہ وہ کتنی ہی ناقص اور نامکمل ہو' تو فوراً اسلامی ریاست کا لیبل پاکستان پر چسپاں کر دیا جائے!

بہر حال ریاست پاکستان کی نئی نظری حیثیت نے جماعت اسلامی کے طرز عمل کو ایک ''سیاسی جماعت'' کے نقشے پر ڈھال دیا' حالانکہ حقیقی صورت حال کے اعتبار سے ابھی ایک ''انقلابی جماعت'' کی سی جدّوجُہد درکار تھی۔ سیاسی جماعت اور انقلابی جماعت کے طریق کار اور طرزِ عمل میں جو باریک سا فرق ہوتا ہے' اسے خود مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں سنیے:

''اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے کہ جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کے طور پر ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے... دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریے اور جہانی تصوّر (world idea) لے کر اٹھتی ہے جس کے سامنے تمام نوع انسانی کے لیے بلالحاظِ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے' جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے' جس کا نظریہ و مسلک' عقائد و افکار اور اصول اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے...''

دونوں کی نوعیت کے اس فرق کے ساتھ ساتھ دونوں کے کارکنوں کے نقطۂ نظر میں بھی زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ سیاسی جماعت کے کارکن اس کے کام کو بس ایک اچھا اور ملک و ملّت کے لیے مفید کام تو سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ کسی طرح بھی ان کے لیے ''زندگی اور موت'' کا مسئلہ نہیں بن سکتا جبکہ ایک انقلابی جماعت

کے کارکن اپنے پیش نظر کام کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتے ہیں(۲۱) ۔ ایک اسلام پسند سیاسی جماعت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے نقطۂ نظر میں تو زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ پہلی طرح کے لوگوں کے لیے ان کا کام ایک ''اضافی نیکی'' اور بھلائی کا کام ہوتا ہے اور دوسری طرح کے لوگ اپنے کام کو ''فرض عین'' سمجھتے ہیں اور اسی کی ادائیگی پر اپنے ایمان و اسلام کا سارا دار ومدار سمجھتے ہیں۔ سیاسی جماعت کے کارکن ایک نظام کو بنیادی

---

(۲۱) یہی وجہ ہے کہ اس دور ثانی میں دور اوّل کے اثرات کی حیثیت سے جو انقلابی جوش کار پایا جاتا تھا' نئے دور کے اپنے اثرات کے پیدا ہو جانے پر جب وہ ماند پڑ گیا تو پھر ہر کام اور ہر مہم کے لیے جماعت کے کارکنوں کو متحرک کرنے کی غرض سے جماعت کے سرکلروں میں ہر مرحلے کو ''زندگی اور موت کا مسئلہ'' کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی ... فطری طور پر ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ انقلابی جوش کار تو اب ختم ہو ہی گیا تھا' اب تو ہر مرحلے پر تحریک پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ اس بات کو سمجھانے کی ضرورت تھی کہ یہ مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور اس پر نہ صرف مستقبل کا پورا انحصار ہے بلکہ ماضی کے کیے دھرے کے باقی رہنے یا ختم ہو جانے کا دارومدار بھی اسی پر ہے !

طور پر صحیح سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ اس میں رہتے ہوئے پورے اطمینان کے ساتھ معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور ''پھلنے اور پھولنے'' کی فکر کرتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے ان کو دل میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن ایک انقلابی جماعت کے کارکن کا معاملہ وقت کے نظام کے ساتھ تصادم اور کشمکش کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اس نظام کے ساتھ تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھلنے اور پھولنے اور ترقی کرنے اور مستقبل بنانے کا معاملہ تو دور رہا اس پر ''قوتِ لایموت'' اور زندگی کی ناگزیر ضروریات کے لیے سعی و جہد اور وقت و محنت کا صرف بھی گراں گزرتا ہے۔ اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان چیزوں کا بس ایک ناگزیر سا حصّہ اپنی ذات کے لیے رکھ کر باقی سارے کا سارا اپنے پیش نظر انقلاب کے برپا کرنے میں صَرف کر دے۔ جماعت کے دورِ اوّل کی خصوصیات میں' میں بیان کر آیا ہوں کہ اُس وقت جماعت کے کارکنو میں بعینہٖ یہی کیفیت پائی جاتی تھی۔ لیکن اس دورِ ثانی میں خصوصاً قرار دادِ مقاصد کے پاس ہونے سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس کا لازمی اور فطری تقاضا تھا کہ ایسا ہو اور عملاً ایسا ہوا کہ اب جماعت کے کارکن ایک سیاسی جماعت کے کارکن معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں کام کا بس اسی قدر جوش اور ولولہ اور اس کے لیے اسی قدر ایثار و قربانی کا مادہ باقی رہ گیا ہے جتنا سیاسی جماعتوں کے کارکنوں میں ہوتا ہے(۲۲)۔ الا ما شاء اللہ۔

اور یہ بھی اسی کا شاخسانہ تھا کہ چند سال بعد ہی جماعت کی رکنیت سے ملازمین سرکار کو مستثنیٰ کردیا گیا۔ یہ فیصلہ اسی وقت ہو جانا چاہیے تھا جبکہ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کے

_____(۲۲) ملک ظفر اللہ خان صاحب ایم اے' خلَف الرشید ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز جماعت اسلامی کے پرانے متعلقین میں سے ہیں۔ اگرچہ زیادہ فعال نہیں تاہم ذہین ضرور ہیں۔ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک عرصے تک جب جماعت کے رکن نہ بنے تو میںنے ان سے اس کے بارے میں ابتداءً سوال اور پھر بحث و تکرار شروع کی۔ انہوں نے اس وقت جو جواب مجھے دیا وہ ان کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ''اب جماعت کی رکنیت کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اب وہ ایک انقلابی جماعت نہیں بلکہ ایک سیاسی پارٹی ہے''۔ میں>

پاس ہونے کے بعد جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے پاکستان کو ''اصولاً'' ایک اسلامی ریاست تسلیم کر لیا تھا۔ اُس وقت شاید اس کا احساس نہ ہوا ہو لیکن جماعت کی نوعیت میں جو اصولی تغیر رونما ہو چکا تھا اس کا نتیجہ بالآخر نکل کر رہا کہ ''دین اور سیاست کی وحدت کا سب سے بڑا علمبردار'' بالآخر یہ کہنے لگا کہ سرکاری ملازمین سیاست میں حصّہ نہ لیں۔ (تقریر حیدر آباد۔ اور ''رسائل و مسائل'')

یہ ساری ہی باتیں قانوناً اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں اور اپنے پہلے قدم کو درست ثابت کرنے کے بعد منطق کے اعتبار اور علّت و معلول کے فلسفے کے تحت ان تمام باتوں کو صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن عملاً یہ تمام باتیں اس لیے مضحکہ خیز اور بالکل غلط ہیں کہ پاکستان کی اسلامی ریاست بس اصولاً ہی اسلامی ہے۔ صحیح اسلامی انقلاب کی طرف ۱۹۴۷ء کے بعد ایک قدم بھی پیش قدمی نہیں ہو سکی ہے۔ اور یہ تمام باتیں عملاً اس وقت صحیح ہو سکتی تھیں جبکہ ایک اسلامی ریاست فی الواقع قائم ہو جاتی۔

* قرارداد مقاصد پاس کرا لینے کی ''فتح'' نے جماعت اسلامی کو ایک اور عظیم نقصان جو پہنچایا وہ یہ تھا کہ اس کے قائد اپنے اور اپنی جماعت کی قوت اور عوام میں اس کے اثر و نفوذ کے بارے میں ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور اس وقت کے بعد سے اپنے اثر اور اپنی طاقت کے بارے میں مبالغہ آمیز اندازے قائم کرنے کا جو مرض جماعت اور اس کی قیادت کو لگا تھا وہ ابھی تک جان کا لاگو چلا آ رہا ہے۔

_____> ان کی اس بات کو تو رد نہ کر سکا البتہ دوسرے استدلال سے ان کو قائل کیا کہ جماعت کی رکنیت ضروری ہے۔ یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

''کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے اب سیاسی بن گئے ہو' حالانکہ ہم پر ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے مذہبی رہے ہوں اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے ''سیاسی'' بن گئے ہوں۔ ہم تو...''

لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں کہنے والوں میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو اسی قسم کے احساسات کے تحت ایسی باتیں کہتے تھے لیکن کچھ وہ خود واضح نہ کر پاتے تھے اور کچھ ان کو سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی گئی۔

اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔

ایک یہ کہ ہم نے اس کام کا سارا کریڈٹ خود لیا حالانکہ اس کے پاس ہونے میں دوسرے عوامل کو بھی دخل تھا۔

ثانیاً جو کچھ اس میں ملا تھا اس کو ایک منطقی اور لمبے چوڑے استدلال کے ساتھ وہ کچھ ثابت کیا کہ جو درحقیقت اس میں موجود نہ تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر جماعت نے دستوری مطالبے کے ساتھ انقلاب قیادت کا نعرہ بھی بلند نہ کر دیا ہوتا تو مسلم لیگی قیادت اتنا کچھ تو بآسانی شروع میں ہی تسلیم کر لیتی... !

بہر حال قرار داد مقاصد جماعت اسلامی پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل اور اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بہت گہرے اثرات جماعت کی آئندہ تاریخ پر مترتب ہوئے !

پہلی دستوری سفارشات

نکتۂ اوّل یعنی دستوری جدّوجُہد میں جماعت اسلامی کو بظاہر دوسری کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب ۱۹۵۰ء میں خان لیاقت علی خان صاحب کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں ہی پہلی دستوری سفارشات پیش ہوئیں اور بہت سی وجوہات کی بنا پر ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو گئیں۔

ان سفارشات کے واپس لیے جانے کے اصل اسباب برسر اقتدار گروہ کے آپس کے اختلافات' مشرقی اور مغربی پاکستان کی قیادتوں کا جوڑ توڑ اور مرکز میں حصول اقتدار کے لیے کشمکش اور تصادم تھے۔ یہ معاملہ قرار داد مقاصد کی منظوری سے بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ اس معاملے میں واقعتاً عوامی مطالبے ہی کے اثرات تھے جو اس قرار داد کی شکل میں رونما ہوئے لیکن سفارشات کی واپسی کے معاملے میں ہر سوچنے سمجھنے والا شخص جانتا ہے کہ عوام کے مطالبات کو اس قدر دخل نہ تھا جس قدر برسرِ اقتدار ٹیم کی آپس کی پھوٹ اور باہمی تصادم کو۔ لیکن اس

واقعے کو بھی ''عوامی فتح'' اور اس سے بڑھ کر ''جماعت اسلامی کی فتح'' قرار دیا گیا اور اس نے ان تمام نفسیاتی اثرات کو دوچند کر دیا جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا

ہے --- یعنی(۲۳) برسر اقتدار گروہ میں جماعت کے مطالبۂ نظام اسلامی و دستور اسلامی سے چڑ' مطالبۂ دستور اسلامی اور جماعت اسلامی کا آپس میں لازم و ملزوم سمجھا جانا اور جماعت اسلامی کے قائدین کا اپنی طاقت اور اثر و نفوذ کے بارے میں غلط اندازوں کا قیام۔

بہر حال پہلے نکتے پر جماعت اسلامی کی جدّوجُہد' گو بظاہر ہی سہی' کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی' لہٰذا فطری بات تھی کہ اس پر مزید جدّوجُہد جاری رکھی جاتی اور ایسا ہی فی' الواقع ہوا۔

انتخاباتِ پنجاب ۱۹۵۱ء

اپنے پروگرام کی شق اوّل کے ساتھ ساتھ جماعت نے شق دوم پر بھی مسلسل کام جاری رکھا تھا۔ تقسیم سے قبل جس بات کی توقع ظاہر کی گئی تھی (ملاحظہ ہوں ص ۱۱۰ پر مندرج اقتباس کے جلی الفاظ) اس کے احساس کو مولانا مودودی صاحب نے ''ترجمان القرآن'' کے مسلسل چار پرچوں (جون تا ستمبر ۱۹۴۸ء) کے ''اشارات'' میں اجاگر اور نمایاں کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ آپ کی گرفتاری کے بعد جناب نعیم صدیقی صاحب نے ترجمان کی ادارت سنبھالی اور ان کی زیر ادارت ترجمان کے اشارات اسی ایک مسئلے کے لیے وقف رہے۔ انہوں نے پاکستانی قوم اور مملکت خداداد پاکستان کے تمام مسائل کا حل ''ایک صالح قیادت'' بتایا۔ ساتھ ہی اس صالح قیادت کے نقش و نگار بھی اجاگر کیے جاتے رہے۔ چنانچہ مولانا عبد الغفار حسن صاحب کے قلم سے ایک مضمون اسی موضوع پر لکھا ہوا ترجمان میں شائع ہوا۔

_____(۲۳) اس کا ایک اندازہ اس وقت ہوا جب ڈھاکہ میں لیاقت علی خان صاحب سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں سوال ہوا تو ان کے منہ سے بے ساختہ جو بات جماعت اور مولانا کے بارے میں نکلی وہ یہ تھی کہ وہ اور جماعت اسلامی اقتدار کے طلب گار ہیں۔ غالباً کچھ اس طرح کے الفاظ تھے:
''وہ (مولانا مودودی) پاکستان کے امیر المؤمنین بننا چاہتے ہیں' حالانکہ پاکستان تو صحیح معنی میں ابھی بنا ہی نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان کو بن لینے دو' پھر جو جس کی مرضی ہو بن لینا!''
اس فقرے میں صرف لیاقت علی ہی نہیں اس وقت کے پورے برسر اقتدار گروہ کا ذہن بول رہا تھا۔

یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ پنجاب کے انتخابات کا موقع آگیا۔ یہ گویا اب تک کی 'کی ہوئی ساری محنت کا پھل حاصل کرنے اور فصل کاٹنے کا وقت تھا۔ چنانچہ جماعت نے اس میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔

پہلی اسیری سے رہا ہونے کے فوراً بعد جو تقریر مولانا مودودی صاحب نے لاہور میں کی' اس میں انتخاب میں حصّہ لینے کے ارادے کا اظہار ہو گیا تھا اور اسی میجماعت کا ایک بے قاعدہ منشور بھی پیش کر دیا گیا تھا۔ انتخاب کے موقع پر منشورِ جماعت اسلامی کو باقاعدہ مرتّب کر کے بڑی آن بان کے ساتھ شائع کیا گیا اور انتخابات میں چھلانگ لگادی گئی۔

اس موقع پر اوّلاً جماعت اسلامی نے علیٰ رئووس الاشہادیہ اعلان کیا کہ محض اس منفی مقصد کی خاطر کہ برسرِ اقتدار گروہ کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے ہمارا کسی ایسے گروہ یا کسی ایسی جماعت سے تعاون اور اشتراک کرنا خارج از بحث ہے جو نظریات و مقاصد اور اصول و طریقہ ہائے کار میں ہم سے اختلاف رکھتے ہوں۔ یاد رہے کہ اس موقع پر حسین شہید سہروردی صاحب کی عوامی لیگ اور نواب ممدوٹ صاحب کی جناح لیگ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ''جناح عوامی لیگ'' کی شکل اختیار کر چکی تھیں اور ان دونوں رہنمائوں کی طرف سے بار بار اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ جماعت اسلامی بھی ان کے ساتھ تعاون کرے تاکہ یہ تمام قوتیں مجتمع ہو کر کوئی مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ لیکن جماعت اسلامی نے اپنے متذکرہ بالا اصول کی بنا پر ایسی تمام دعوتوں کو مسترد کر دیا۔

ثانیاً انتخابات کے موقع پر جماعت اسلامی نے ایک مخصوص طریق کار اختیار کیا جو جدید جمہوریت کی تاریخ میں واقعتاً انوکھے اور نرالے تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس طریق کار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں امیدواری اور پارٹی سسٹم کو طریق انتخاب کے امہات الخبائث قرار دے کر ترک کر دیا گیا۔ امیدواری کے خلاف انتہائی شدّت کے ساتھ یہ کہا گیا کہ یہ سراسر حرام ہے اور اس کے جواز کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور جب معترضین نے اس شدّت پر ٹوکا اور قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ سے چند شواہد ایسے پیش کیے جن سے کسی درجے میں اس کے جواز کی جانب اشارہ

ملتا تھا تو ان میں سے ایک ایک کا مُسکت جواب دیا گیا اور قطعیت کے ساتھ طے کر دیا گیا کہ اسلام میں امیدواری کے لیے کوئی جگہ موجود نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو ''جماعت اسلامی کی انتخابی جدّوجُہد'')

اسی طرح پارٹی سسٹم کو بھی یہ کہہ کر ردّ کر دیا گیا کہ یہ بھی در اصل اجتماعی پیمانے پر امیدواری ہی کی ایک صورت ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں دو چند بلکہ سہ چند ہو جاتی ہیں جو امیدواری سے پیدا ہوتی ہیں۔ جماعت کے ''قطعی فیصلے'' کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''رسولِ برحق کے یہ ارشادات (۲۴) بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے جن کی سچائی پر عقل عام

گواہی دے رہی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی' نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی' نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لیے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے' خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدّوجُہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نا اہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے' اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔'' (جماعت اسلامی کی انتخابی جدّوجُہد)

امیدواری اور پارٹی سسٹم کو حرام قرار دے کر جماعت اسلامی نے جو طریق انتخاب ایک ''صالح قیادت'' کو برسر کار لانے کے لیے اختیار کیا' وہ یہ تھا کہ جماعت اوّلاً ان حلقہ ہائے نیابت کو اپنی جدّوجُہد کے لیے منتخب کرے گی جن میں پہلے ہی سے اس کا اثر و نفوذ

---

(۲۴) احادیث کی تفصیل ''جماعت اسلامی کی انتخابی جدّوجُہد'' نامی پمفلٹ میں ملاحظہ ہو۔

موجود ہے اور جہاں اس کے امکانات روشن ہیں کہ اگر محنت کی جائے تو کامیابی کی صورت پیدا ہو جائے۔ پھر ان حلقوں کے ووٹروں سے رابطہ قائم کیا جائے گا اور ان کے سامنے جماعت اپنے مقاصد کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے گی۔ پھر جو ووٹر جماعت کے مقاصد سے اتفاق کر لیں گے ان پر مشتمل انتخابی پنچایتیں بنائی جائیں گی۔ ہر ووٹر جو جماعت کی انتخابی جدّوجُہد سے متفق ہو' یہ عہد نامہ پُر کرے گا:

ووٹر کا عہد نامہ

مَیں ایک مسلمان پاکستانی ووٹر ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ جو حکومت خدا کی شریعت پر قائم ہو اور جس کا انتظام خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہو' صرف اسی کے ہاتھوں سے بندوں کو انصاف اور چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں اپنے ملک میں ایسی ہی حکومت چاہتا ہوں۔

مَیں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اچھی اور بری حکومت قائم ہونے میں میرے ووٹ کا بھی حصّہ ہے۔ میں اچھے لوگوں کو ووٹ دوں گا تو اچھی حکومت قائم ہو گی اور اس کا اجر دنیا و آخرت میں مجھے بھی ملے گا۔ اور اگر مَیں نے بُرے لوگوکو ووٹ دیا تو بُری حکومت قائم ہو گی اور اس سے صرف دنیا ہی میں مجھے اور دوسرے بندگان خدا کو تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ آخرت میں بھی اس کی برائیاں میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

لہٰذا میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ:

۱) مَیں ووٹ دینے میں ذاتی فائدے اور نقصان کا یا اپنی ذات اور برادری کے تعلقات کا لحاظ نہ کروں گا۔

۲) مَیں صرف اس شخص کو ووٹ دوں گا جو اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں خدا اور رسولؐ کے احکام کا پابند ہو' جو اپنے لین دین میں ایمان دار اور اپنے معاملات میں کھرا ہو' جو اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔

۳) مَیں کسی ایسے شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو خود امیدوار بن کر کھڑا ہو اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔
۴) اگر مجھے کوئی نیک آدمی ووٹ دینے کے لیے نہ ملے گا تو مَیں سرے سے ووٹ ہی نہیں دوں گا۔
خدا مجھے اس عہد کو پورا کرنے کی توفیق دے۔ آمین'' (ایضاً)

اس عہد نامے کو پورا کرنے والے رائے دہندگان کو ابتدائی اور ثانوی پنچایتوں کی شکل میں منظم کیا جائے گا اور پھر یہ پنچایتیں اپنے حلقے میں سے ایک ''صالح نمائندہ'' منتخب کریں گی۔ اس ''صالح نمائندے'' کی حسب ِذیل ''نشانیاں'' جماعت نے رائے دہندگان کے سامنے رکھیں۔

صالح نمائندے کی نشانیاں

اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے آدمی میں یہ چار شرطیں پائی جانی ضروری ہیں:
اوّل : وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں اسلام کا سچا پیرو ہو' وہ خدا کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ادا کرتا ہو' وہ کھلے کھلے گناہوں کا مرتکب نہ ہو' اس کے گھر میں خدا کے قوانین علانیہ نہ توڑے جاتے ہوں۔

دوم : لوگوں نے اپنے تجربے میں اس کو ایک سچا' ایمان دار اور کھرا آدمی پایا ہو۔ اس کی بستی کے عام لوگ اس بات کے گواہ ہوں کہ وہ ایک نیک انسان ہے۔ وہ جھوٹا اور بد معاملہ نہ ہو۔ وہ حرام خور' ظالم اور دوسروں کا حق مارنے والا نہ ہو۔ وہ رشوتیں کھانے اور کھلانے والا نہ ہو۔ اس کا دامن لوٹ مار سے' ناجائز الاٹمنٹوں سے اور بلیک مارکیٹنگ سے پاک ہو۔

سوم : وہ دین اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑا عالم فاضل اور کسی دینی مدرسہ کا سند یافتہ ہو لیکن بہرحال اسلام کے اصولوں سے اس کا واقف ہونا ضروری ہے' کیونکہ جب تک وہ اسلام کو جانے گا نہیں' آخر وہ ایک اسلامی نظام حکومت چلائے گا کیسے ! اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو کیونکہ اس

کے بغیر وہ آخر ان سیاسی' معاشی' تمدنی' تعلیمی' قانونی اور انتظامی مسائل کو کیسے سمجھے گا' جن پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کرنا ہے !

چہارم : وہ جاہ و طلب اور عہدے کا حریص نہ ہو۔ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں نہ آئے جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ اسمبلی میں جانے کے لیے خود کوشاں ہے۔''

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدّوجُہد)

اور پھر یہ تصریح کی کہ:

''اس طریقے سے جو شخص بھی چھانٹا جائے گا اسے حلقہ انتخاب کے عوام کی طرف سے کھڑا کیا جائے گا۔ وہ شخص خواہ جماعت اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو' یہ جماعت اسی کی تائید کرے گی۔ اس کو اپنا زرِ ضمانت خود ادا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی' حلقہ انتخاب کے عام لوگ اس کی طرف سے ادا کریں گے۔ وہ انتخاب کی مہم میں ایک پیسہ اپنی جیب سے خرچ نہ کرے گا' سارا خرچ حلقہ کے لوگ کریں گے۔ وہ اپنی تعریف کے گن آپ نہ گاتا پھرے گا اور نہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے ایجنٹ چھوڑے گا' اس کے اوصاف وہ لوگ بیان کریں گے جنہوں نے اسے کھڑا کیا ہو گا اور وہی اس کے حق میں عام رائے دہندوں کی رائے ہموار کریں گے۔ اس کی ذات پر اگر کیچڑ اچھالی جائے گی تو اسے صاف کرنے کی زحمت وہ خود نہ اٹھائے گا' یہ فرض اس کی طرف سے دوسرے لوگ انجام دیں گے۔ اس کو یہ حق تو ضرور ہو گا کہ کسی دوسرے حلقے میں' کسی دوسرے مرد صالح کی تائید کے لیے جا کر انتخابی جدّوجُہد کرے' مگر خود اپنے حلقے میں اپنے لیے وہ کوئی جدّوجُہد کرنے کا حقدار نہ ہوگا۔ اپنے حلقے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ اسے کرنا ہو گا وہ صرف یہ کہ اگر حلقے کے عام لوگ اس کو دیکھنا اور اس کے خیالات سننا چاہیں گے' تو وہ ان کے جلسوں میں آئے گا اور ان کو موقع دے گا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھیں اور ہر پہلو سے پرکھ لیں۔'' (ایضاً)

ان اصول و ضوابط کے مطابق انتخابات میں حصّہ لیا گیا---- اور جماعت اسلامی کی پوری قوت کو ملک کے گوشے گوشے سے جمع کر کے پنجاب کے انتخابی میدان میں لے آیا گیا۔

* اس انتخاب میں حصّہ لینے سے قبل اس کے بارے میں جو توقعات جماعت کے اکابرین کو تھیں' ان کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس سے جماعت اسلامی کے

قائدین کی ملکی حالات اور معاشرے کی کیفیات کے بارے میں آراء کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کچھ معلومات ملتی ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کے بارے میں سنا گیا کہ وہ کم و بیش تیس سیٹوں پر کامیابی کا ''یقین'' رکھتے تھے اور مولانا اصلاحی صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک موقع پر ذرا تاریک پہلو پر نگاہ رکھنے والے ایک شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا ''آپ اتنے مایوس ہوئے جا رہے ہیں حالانکہ ہم تو ایک کولیشن وزارت کی توقع رکھتے ہیں!'' ----- یہ اس جماعت کے دو انتہائی چوٹی کے لیڈروں کی توقعات تھیں ----- جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں' قرار دادِ مقاصد کی ''شاندار فتح'' کے بعد سے جماعت کے قائدین کو اپنے اور جماعت کے اثرات کے

بارے میں بالکل غلط اندازے قائم کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں جماعت کے اکابرین اور عام کارکنوں میں یہ احساس عام تھا کہ بس میدان مار لیا -----اور اسلامی نظام قائم ہوا کہ ہوا ! (بلکہ حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھا جاتا تھا کہ مولانا اصلاحی صاحب کے بیان کردہ ''دعوتِ اسلامی کے مراحل''بیچ میں سے کہاں غائب ہو گئے۔ یہ تحریک تو ان مراحل سے گزرے بغیر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے !) (۲۵)

حیرت ہوتی ہے کہ وہی مولانا مودودی جو چند ہی سال پہلے اس قوم کا صحیح صحیح تجزیہ کر چکے تھے اور جنہوں نے اس کی ایک ایک خامی اور ایک ایک برائی کو پوری وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کیا تھا' اب اسی قوم کے بارے میں ان خوش فہمیوں میں کس طرح مبتلا ہو گئے !

پھر اس سے قبل صحیح تجزیہ نہ ہوا ہوتا' تب بھی یہ بات تو سیاسیات کے ایک ادنیٰ طالب علم کی سمجھ میں بھی آجانی چاہیے تھی کہ پاکستان میں ایک مخصوص معاشی اور اقتصادی نظام قائم ہے۔ یہاں کے عوام و خواص کی ایک غالب اکثریت کسی اصول حیات سے ناآشنا محض مفاد اور اندھی منفعت پرستی کی زندگیاں بسر کر رہی ہے۔ برادریوں اور

_____(۲۵) ملاحظہ ہو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار'' کا باب ''دعوتِ اسلامی کے مراحل''

خاندانوں کے جال نے لوگوں کو باندھ رکھا ہے۔ مزارع زمیندار اور مزدور کارخانہ دار کی مرضی کے خلاف حرکت تک نہیں کر سکتا----- تو اس معاشرے میں ایک صالح قیادت آخر کون سے معجزے کے تحت برپا ہو سکتی ہے !

اور جب ہوا میں بنے ہوئے یہ محل اور مٹی کے یہ گھروندے زمین پر آرہے اور تیس کی بجائے جماعت کے طریق کار کے تحت ایک شخص بھی کامیاب نہ ہو سکا (۲۶) تو پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ اپنی ''اصول پرستی'' ہی کو ''عظیم الشان فتح'' کی حیثیت سے پیش کیا جاتا !

اور یہ بہر حال واقعہ ہے کہ جہاں تک میری ذاتی معلومات کا تعلق ہے' جس اصول پرستی کا مظاہرہ جماعت اسلامی نے ان انتخابات میں حصّہ لیتے ہوئے کیا اس کی مثال جدید جمہوریت کی تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔ جماعت نے جو بھی طریق کار ابتدا میں وضع کر لیا تھا----- قطع نظر اس سے کہ وہ غلط تھا یا صحیح-----اور اس میں خامیاں تھیں تو کیا-----بہر حال آخر دم تک اس کی پوری پابندی کی اور اس بات کو برداشت کر لیا کہ ایک بھی نمائندہ کامیاب نہ ہو لیکن اسے گوارا نہ کیا کہ اپنی اصول پسندی پر کوئی آنچ آئے ! ابتدا سے لے کر انتہا تک جماعت ہر قسم کی سودا بازی سے پاک رہی اور کسی ایسے غلط ذریعے کو اس نے بالکل استعمال نہ کیا جس سے کامیابی کے امکانات تو روشن ہوتے

ہوں لیکن کوئی اصول کسی طرح مجروح ہوتا ہو۔

یہ اصول پسندی جس کا جماعت اسلامی نے اس موقع پر مظاہرہ کیا جماعت کے اس دورِ ثانی میں بڑی نمایاں حیثیت سے سامنے آتی ہے' لیکن یہ اصل میں جماعت کے دور اوّل کی خصوصیات کی ''باقیات الصالحات'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک جماعت کے دورِ اوّل کی وہ خصوصیات جن کا میں نے دور اوّل کا تذکرہ کرتے ہوئے چھٹی اور

---

(۲۶) واضح رہے کہ مولوی محی الدین لکھوی باقاعدہ جماعت کے اختیار کردہ طریق کار کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے' بلکہ وہ اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر منتخب ہوئے اور ان کو اپنے ''صالح نمائندے'' کے معیار پر پورا پا کر جماعت نے adopt کر لیا تھا !

ساتویں شق میں تفصیلاً ذکر کیا ہے' شدّت اور پوری آن بان کے ساتھ قائم تھیں اور انہی کی ایک جھلک انتخاباتِ پنجاب کے موقع پر ظاہر شدہ اس اصول پرستی میں نظر آتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرا اور دورِ ثانی کے طریق کار کے نتائج رونما ہونے شروع ہوئے' رنگ قدیم پھیکا پڑتا چلا گیا اور وہ رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا جو اس دور جدید کے طریق کار کا فطری اور منطقی نتیجہ تھا۔ اور آج اُس وقت کی اصول پرستی کو ایک حماقت قرار دینے والے بھی جماعت میں پائے جاتے ہیں بلکہ اس کے اہم مناصب پر فائز ہیں۔ آئندہ انتخابات کے بارے میں جو طریق کار اس وقت ذہنوں میں زیرِ غور ہے وہ بالکل اس طریق کار کا ہیولیٰ ہے جسے ایک بے اصول اور محض اقتدار پرست جماعت ہی اختیار کر سکتی ہے۔ (اس کی تفصیل آئندہ کسی موقع پر عرض کروں گا) (۲۷)

۱۹۵۱ء میں جب جماعت اسلامی اپنی اصول پسندی کا عملی مظاہرہ کر رہی تھی تو قدرت مسکرا رہی تھی کہ دور اوّل کے ثمرات سے چند روز اور متمتع ہو لو۔ اب جس فصل کے بیج بو چکے ہو اور جس کی آبیاری مسلسل کر رہے ہو' وہ دن دور نہیں کہ وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی بن کر تمہارے سامنے آ جائے۔ اس وقت آج کی یہ اصول پسندی ایک بھولی بسری داستان

---

(۲۷) اس تفصیل کو بیان کرنے کا موقع تو پیش نظر تحریر میں نہ آیا لیکن بعد کے حالات میں جماعت اسلامی نے اپنے مخصوص طریق انتخاب کی تمام شقوں کو ایک ایک کر کے جس طرح ترک کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ پہلے پارٹی سسٹم اور پارٹی ٹکٹ کو ''حلال'' کیا گیا ! ----- پھر امیدواری کو ''مسلمان'' کیا گیا۔ غرض ع ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز'' کے سب سے بڑے داعی کو عملاً ع ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز'' پر

کاربند ہونا پڑا ہے

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

یہ تمام تبدیلیاں جو جماعت اسلامی نے طریق انتخاب میں اختیار کیں' انتخاباتِ پنجاب کی ''شکست فاش'' کے فوراً بعد ذہنوں ہی میں نہیں اس کے راہنمائوں کی گفتگوئوں تک میں گردش کرنے لگی تھیں' لیکن اس وقت تو اپنی ''اصول پرستی'' کو ''فتح مبین'' قرار دے کر اطمینان حاصل کر لیا گیا اور بعد میں رفتہ رفتہ ان اصولوں کو بقدر ضرورت ''حالات'' کی قربان گاہ پر ذبح کیا جاتا رہا !

معلوم ہو گی اور ممکن ہے کہ ''حماقت'' نظر آئے !

اپنی عملی جدّوجُہد کی دوسری شق یعنی ''انقلابِ قیادت'' کی مہم میں انتخاباتِ پنجاب جماعت اسلامی کی کم از کم اتنی بڑی ناکامی ضرور تھی جتنی بڑی کامیابی شق اوّل یعنی دستوری جدّوجُہد کے سلسلہ میں قرار داد مقاصد کو سمجھا گیا تھا اور یہ جماعت کے لیے ایک زریں موقع تھا کہ وہ ان نتائج کو دیکھ کر جو انتخابات سے برآمد ہوئے اپنے غلط اندازوں کی تصحیح کر لیتی اور اگر کسی وجہ سے اب تک حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہو گئی تھی تو اب جب کہ صحیح صورت حال کھل کر سامنے آ گئی تھی' غلطی کی اصلاح کر لی جاتی۔ چنانچہ اس زمانے میں جماعت میں عارضی طور پر اس طریق کار سے بد دلی اور مایوسی واقعتاً پیدا ہوئی بھی تھی جو انقلاب قیادت کے لیے کار آمد سمجھ کر اختیار کیا گیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اپریل ۱۹۵۱ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے باقاعدہ اس مسئلے پر غور و خوض کیا کہ ''پنجاب کے حالیہ انتخابات کے نتائج کو دیکھتے ہوئے آیا الیکشن کے ذریعے سے یہاں اصلاح ممکن ہے؟''----- شوریٰ نے بہت ''غور و خوض'' کے بعد یہ رائے قائم کی کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے' بلکہ اس طریق کار کو جاری رکھنے کے لیے خود ان انتخابات کے کوائف ہی میں دلائل موجود ہیں !

اس سلسلے میں ''روداد مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان منعقدہ ۱۵ تا ۱۹، اپریل ۱۹۵۱ء'' کے وہ صفحات (۵ تا ۱۰) پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن میں اس مسئلے پر مجلس شوریٰ نے اپنا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس تجزیے میں ایک طرف اعداد و شمار کے ذریعے کارکنان جماعت کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ اگرچہ ہم ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے تاہم اتنے لوگوں نے ووٹر کا عہدنامہ پُر کیا' اتنوں نے ہمیں ووٹ دیے... وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف اس معاشرے اور اس کی انتظامی مشینری کی ان تمام خرابیوں کو جو اس کا جزوِ لاینفک ہیں اور اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں' ایسے بیان کیا گیا جیسے یہ کوئی بلائے ناگہانی تھی جو کہیں باہر سے نازل ہو گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو ہماری کامیابی یقینی تھی !

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی !

بہر حال اس طریق کار کے بارے میں جو تھوڑی بہت خلش جماعت کے کارکنوں میں پیدا ہو گئی تھی' اسے شوریٰ کے اس تجزیے نے ختم کر دیا اور ان دونوں نکات پر جماعت اسلامی پاکستان کی جدّوجُہد جاری رہی ----- اور یہ قافلہ ذرا سستا کر پھر اسی راہ پر گامزن ہو گیا۔ ع ----- ''یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر !''

بعد کے مراحل

بعد کے مراحل میں بھی اگرچہ جماعت کی اصل مساعی انہی دو نکات پر مرتکز رہیں لیکن کہیں کہیں کچھ اور کاموں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ رفاہِ عامہ کے کام' اصلاح معاشرہ کی کوششیں' سعیٔ تحفظ اخلاقِ عامہ' تعلیمی سکیمیں ... وغیرہ۔ لیکن یہ کوششیں بس ضمنی سی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کسی کے سلسلے میں اگر کام ہوا بھی تو بس ان ہی کے سلسلے میں کہ جو ان دو نکات میں fit بیٹھتے ہوں اور اسی قدر کہ جس قدر ان دو نکات کے نقشہ کار میں ان کی ضرورت محسوس کی گئی۔

اس کے علاوہ یہ کام ہو بھی صرف اسی زمانے میں سکے ہیں' بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں صرف اسی زمانہ میں ان کا خیال پیش کیا گیا ہے (اس لیے کہ عملاً کام تو کچھ ہوا ہی نہیں) جبکہ مہماتی کام کے ختم ہونے کی وجہ سے ''کام کا

خلا'' محسوس کیا گیا۔ مثلاً:

۱۔ قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد کے ''خلا'' کے زمانے میں ''رودادِ مجلس شوریٰ'' میں پیش کردہ اصلاحی، تعلیمی اور رفاہی کاموں کا پروگرام ----- جس کو شروع ہونے سے قبل ہی انتخابات کی مہم نے ختم کر دیا۔

۲۔ دستوری مہم نمبر ۲ کے ختم ہو جانے کے بعد ''انجمن تحفظ اخلاق عامہ'' کی قسم کے کام کا پروگرام ---- -جسے اس کی کاغذی تکمیل سے بھی قبل اینٹی قادیانی تحریک اور اس سے پیدا شدہ حالات نے ختم کر دیا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ

کہیںکہیں منتشر مساعی کچھ اور بھی نظر آتی ہیں لیکن اصل توجّہ بعد کے مراحل میں بھی انہی دو نکات پر مرکوز رہی !

بعد کے ادوار میں ان دونوں شقوں پر کام کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

دستوری جدّوجُہد

اس جدّوجُہد کی تاریخ میں ۱۹۵۲ء ایک یادگار سال ہے۔ اس سال کے اوائل میں مولانا مودودی صاحب نے کراچی کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کر کے دستورِ اسلامی کا ہشت نکاتی مطالبہ پیش کیا جو بعد میں (احرار کی قیادت میں اینٹی قادیانی مطالبات کے شدّت اختیار کر جانے کے باعث) نو نکاتی بنا دیا گیا۔ مسلسل کئی ماہ دستوری مہم پورے زور شور کے ساتھ چلتی رہی اور اواخر ۱۹۵۲ء میں جو دو دستوری ہفتے منائے گئے وہ اس جدّوجُہد کی climax کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دستوری مہم ایک مہم ہونے کے اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ ابتدا میں اس بات کا خطرہ تھا کہ اس مرتبہ پھر پہلے ہی کی طرح سفارشات سامنے لائی جا رہی ہیں لیکن ''پہلے دستوری ہفتے'' نے خواجہ ناظم الدین صاحب اور ان کی وزارت کو مجبور کر دیا کہ جو سفارشات مرتب ہو چکی تھیں، ان میں ترامیم کی غرض سے دستوریہ کا اجلاس ایک ماہ مؤخر کر دیا جائے۔ اور پھر ''دوسرے دستوری ہفتے'' نے جس کے دوران غالباً پہلی مرتبہ جماعت نے انتہائی کامیاب جلوس بھی نکالے، رہی سہی کسر پوری کر دی اور دستور میں اسلامی مطالبات کو

کسی حد تک تسلیم کر لیا گیا۔ یہ سفارشات جو غالباً اپنے اسلامی ہونے کے لحاظ سے خاصی قابلِ قبول تھیں، دسمبر ۱۹۵۲ء میں دستوریہ کے اجلاس میں پیش ہوئیں۔

اس مہم کے دوران کے کام اور ان سفارشات کے پیش ہونے میں کن کن عناصر کو کس کس حد تک دخل تھا، اس کے ضمن میں دو باتیں بالکل واضح ہیں:

۱۔ خود دستوریہ میں اچھا خاصا عنصر ''مخلصین مسلم لیگ'' کا ابھی تک موجود تھا۔ مثلاً خواجہ ناظم الدین صاحب، سردار عبد الرب نشتر صاحب وغیرہم۔

۲۔ اگرچہ اس سے قبل بھی علماء کی طرف سے دستوری مہمات میں کسی قدر تائید ہوتی

رہی تھی لیکن اس سال جمعیت علمائے اسلام کا وہ گروہ جو کراچی میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے رفقاء اور لاہور میں مولانا عبد الحلیم قاسمی اور مولانا دائود غزنوی پر مشتمل تھا، اس نے جماعت کا کافی ساتھ دیا بلکہ مقدّم الذکر گروہ نے تو از خود حرکت میں آکر بہت قابلِ قدر خدمات سر انجام دیں۔ پاکستان بھر کی دینی جماعتوں اور فرقوں کے نمائندہ علماء کا جو اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اور جس میں دستور اسلامی کے متفقہ اساسی اصول پیش کیے گئے (یاد رہے کہ یہ دستاویز دستور کی مہم میں انتہائی ممد و معاون ثابت ہوئی تھی) وہ انہی حضرات (بشمول مولانا ظفر احمد انصاری صاحب) کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا۔ سفارشات کے پیش ہو جانے کے بعد جنوری ۱۹۵۳ء میں انہی علماء کا ایک اور اجلاس ہوا جس نے سفارشات پر اپنی آراء پیش کیں!

۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے دو سال جن ہنگاموں میں گزرے ہیں ان کی تفصیل لاحاصل ہے۔ ان کا جو نتیجہ ''دستوری مہم'' پر مرتب ہوا وہ یہ تھا کہ جو کام ایک طول عرصے میں کیا گیا تھا، وہ پھر گویا ایک دم کالعدم ہو گیا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب کے بعد مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں ''درآمد شدہ وزیر اعظم'' محمد علی بوگرا تشریف لائے اور انہوں نے خالص سیکولر قسم کے دستور کے نفاذ کے عزائم کا اظہار کیا۔ یہ زمانہ جماعت اسلامی پر انتہائی کٹھن تھا لیکن اس کے باوجود اس زخم خوردہ حالت میں بھی جماعت نے اپنی قوتوں کو مجتمع کیا اور پھر مطالبات کی مہم شروع ہو گئی۔ آخر کار ستمبر ۱۹۵۴ء میں پھر کامیابی کی صورت نظر آئی اور دستوری سفارشات میں ''اسلامی دفعات'' برقرار رکھ لی گئیں۔

اس کے بعد ایک اور بم پھٹا ------ اور دستوریہ ہی توڑ دی گئی۔ گویا کہ کیا کرایا کام ایک مرتبہ پھر نیست و نابود ہو گیا۔ یہ پاکستان کی دستوری تاریخ میں انتہائی شدید انتشار اور تعطل کا دور تھا۔ اس وقت اسلام اور دستور اسلامی تو دُور رہے' اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل بھی تاریک نظر آ رہا تھا اور سخت خدشہ تھا کہ کہیں ایک فوجی آمریت ملک پر مسلط نہ کر دی جائے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ تربیت یافتہ رائے عامہ اور منظّم عوامی قوت' اگر ان کا وجود پاکستان میں واقعی پایا جاتا تھا تو وہ برسرکار آتیں اور ان خطرات کا مقابلہ کرتیں' لیکن ہر سوچنے سمجھنے والا شخص جانتا ہے کہ اس موقع پر ثابت ہوا کہ ان دونوں کا پاکستان میں معدوم ہونے کی حد تک فقدان ہے۔ اگر ''اوپر کے لوگ'' اس موقع پر فوجی آمریت قائم کرنے پر اتر آتے تو پاکستان میں کوئی قوت ایسی موجود نہیں تھی جو میدان میں آکر انہیں للکار سکتی۔ خصوصاً جماعت اسلامی کے لیے تو اس بات کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ وہ فوجی آمریت کے قیام کو resist کر سکتی۔

اب اسے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کا فضل و کرم کہہ لیجیے' یا اس بات کا اثر کہ کچھ اور ہی عوامل نے پاکستان کے حکمرانوں کو اس سے باز رکھا اور کسی نہ کسی طرح فوجی آمریت کا خطرہ ٹل گیا۔

لیکن دستوری تعطل اب بھی موجود تھا۔ ''نفاذ دستور بذریعہ آرڈیننس'' کی تجویز سامنے آئی اور واپس لے لی گئی۔ ''نامزد دستوریہ'' کا خطرہ سامنے آیا اور ٹل گیا ----- اور بالآخر ایک منتخب دستوریہ عالم وجود میں آئی اور اس طرح ایک اور ''دستوری مہم'' کی ضرورت سامنے آگئی۔

لیکن اب ایک طرف جماعت اسلامی کے ہاتھ پائوں (یعنی اس کے کارکن) شل ہو چکے تھے اور اس کے قویٰ جواب دیتے محسوس ہو رہے تھے اور دوسری طرف عوام بھی کسی دستوری مہم کے لیے تیار نہ تھے۔

اوّلاً عوام ایک طویل عرصے تک ''دستخط'' کرتے' خطوط لکھتے اور تاریں بھیجتے تھک چکے تھے' اور ان میں کچھ تو مایوسی غالب آگئی تھی اور کچھ خاص طور پر ان ذرائع پر سے ان کا اعتماد کم ہو گیا تھا۔

ثانیاً جماعت کے کارکن بھی تھک چکے تھے۔ ایک تو ایک ہی طریقے پر کام کرتے کرتے اب کیفیت یہ پیدا ہو گئی تھی کہ وہی طریقے جو پہلے جاذبِ نظر تھے' اب ان کی جاذبیت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ دوسرے' ایک طویل عرصے تک مہماتی کاموں میں مسلسل

انہماک کے باعث اب ان کی کیفیت اس مشین کی سی ہو گئی تھی جو مسلسل بغیر سروس کے استعمال کی جائے۔ بوسیدگی کے آثار اب بالکل نمایاں تھے۔ ''سمع و طاعت'' کے پیچ بھی اب قدرے ڈھیلے تھے اور جوشِ کار اور جذبۂ

ایثار کا تیل بھی اب خشک ہو چکا تھا۔ تیسرے' اس ''دورِ ثانی'' کی ''سیاسیت'' بھی رنگ لا رہی تھی۔ دور اوّل کے اثرات کا بچا کھچا اثاثہ جس سے اب تک کام چل رہا تھا' اب ختم ہو رہا تھا اور نئے طریق کار اور نوعیت جماعت کے انقلاب کے فطری اثرات اب ظاہر ہو رہے تھے۔ لہٰذا اس مرتبہ ''دستوری مہم'' کے لیے عوام کی بجائے دستوریہ کے ارکان کی طرف رجوع کیا گیا اورچونکہ اب تمام تر توقعات بس انہی سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں لہٰذا سارا زور انہی پر صرف کر دیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر جماعت اسلامی نے ایک بہت بڑی بے اصولی کا ارتکاب کیا۔ میری مراد یہاں میاں عبد الباری صاحب کے انتخاب کے لیے کی گئی اس دوڑ دھوپ سے ہے' جو جماعت کے مرکزی سٹاف کے لوگوں نے کی۔ میاں صاحب کی انتخابی مہم میں جماعت کے تعاون سے ایک طرف امیدواری اور پارٹی سسٹم کو سند جواز عطا ہو گئی اور دوسری طرف یہ اصول بھی مجروح ہو گیا کہ جو لوگ مقصد' نصب العین اور طریق کار میں جماعت سے اختلاف رکھتے ہوں' جماعت ان کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتی۔ جماعت کے اجتماع ارکان منعقدہ اجتماع سالانہ ۱۹۵۵ء میں جب اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو قیم جماعت جناب طفیل محمد صاحب نے انتہائی اطمینان کے ساتھ یہ ''قاعدہ کلیہ'' ارشاد فرمایا کہ ''اصول کاغذ پر کچھ اور ہوتے ہیں اور جب عمل کی دنیا میں آتے ہیں تو کچھ اور ہو جاتے ہیں ... '' دیکھنے والوں کو ان الفاظ کے دوش پر جماعت اسلامی کی اصول پسندی (جس کا مظاہرہ بڑے طمطراق کے ساتھ انتخاباتِ پنجاب ۱۹۵۱ء میں کیا گیا تھا) کا جنازہ جاتا نظر آ رہا تھا۔ ؎

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اِک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے !

آج جماعت اسلامی کے انتہائی ذمہ دار افراد کے منہ سے وہ کلمات نکل رہے تھے جن کے

خلاف بولتے اور لکھتے جماعت کو عمر گزر گئی تھی اور خود جماعت کا جو حال ہو چکا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ اس بھرے اجتماع میں جہاں جماعت اسلامی پاکستان کے ارکان کی اکثریت موجود تھی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو کھڑے ہو کر کہنے والے کی زبان نہ پکڑ سکتا' تردید تو کر دیتا ! ؎

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے !

بہر حال یہ آخری مہم جس طرح بھی چل سکی ‘چلائی گئی ----- اور کچھ اس کے اور کچھ دوسرے عوامل کے اثرات کی بنا پر چودھری محمد علی صاحب کے ہاتھوں وہ دستور بن کر نافذ ہو گیا جسے جماعت اسلامی نے ’’اسلامی دستور کی کم از کم لازمی شرائط پورا کر دینے والے دستور‘‘ کی حیثیت سے قبول کر لیا اور اس طرح جماعت کے پروگرام کی شق اوّل پر نو سالہ مساعی کا ’’نتیجہ‘‘ نکل آیا۔ اس نتیجے کا جائزہ میں بعد میں لوں گا۔

انقلابِ قیادت

انقلابِ قیادت کے لیے جماعت اسلامی کے اختیار کردہ طریق کار کے بنیادی فلسفے کا اوّلین سراغ اس تقریر میں ملتا ہے جو ۱۹۴۷ء میں مدراس میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد عملی جدّوجُہد کا آغاز مسلم لیگی قیادت پر اس شدید تنقید سے کیا گیا جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس تنقید کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مسلم لیگی قیادت نے قومی جنگ میں اناڑیوں کی طرح حصّہ لیا اور اس طرح یہ ان تمام مصائب و آلام کی ذمہ دار ہے جو تقسیم کے وقت مسلمانوں پر نازل ہوئے اور یہ قیادت اس لائق نہیں ہے کہ آئندہ کے لیے اسے قومی زندگی کی گاڑی کا ڈرائیور بنا دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ان کی زندگیاں سراسر مغربی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں‘ اور اسی رنگ میں یہ پورے پاکستان کو رنگ دینا چاہتے ہیں۔ اس ابتدائی کام کے بعد جماعت ایک فریق کی حیثیت سے انتخاباتِ پنجاب کے test match میں شریک ہوئی اور بری طرح شکست کھا کر پسپا ہوئی۔ بعد کے مراحل میں بھی ’’تنقید‘‘ کا یہی طریق کار اختیار کیا گیا لیکن اس میں اس شکست کے

باعث انتہائی تیزی ‘تندی اور تلخی ----- جو بعض اوقات تو بے رحمی کی حد تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے-----پیدا ہو گئی۔

اب ’’تنقید‘‘ دو صورتوں میں ہو رہی تھی:

* ’’برسرِ اقتدار گروہ‘‘ کے لوگوں کی انفرادی زندگیوں کے نقائص اور عیوب کی تشہیر اور ان کی ان سرگرمیوں کی مذمت جو وہ پاکستانی معاشرت کو بالکل مغربی طرز پر ڈھالنے کے سلسلے میں کر رہے تھے۔

یہ کام جس طرح پر ہوا اس کا اندازہ کرنے کے لیے ----- ہمارے ’’ادبِ ثقیل‘‘ میں سے اوّلاً مولانا مودودی صاحب کی تقریر ’’مطالبۂ نظامِ اسلامی‘‘ کا وہ حصّہ جو اس سے بحث کرتا ہے‘ پھر مولانا امین احسن صاحب کی ۱۹۵۰ء والی تقریر ’’ہمیں کس مقام پر لا کھڑا کیا گیا ہے!‘‘ اور ’’پاکستانی عورت دوراہے پر‘‘ کا مطالعہ مفید ہے---- - اور ’’ادبِ لطیف‘‘ میں سے نعیم صدیقی صاحب کے مزاحیہ مضامین (جیسے ’’وزیر اعظم نے نمازِ جمعہ ادا کی‘‘ اور ’’... نے روزہ رکھا‘‘ وغیرہ)‘ جناب اسعد گیلانی صاحب کے تیز و تند طنزیہ مضامین (جن کا دوسرا نام ’’جہانِ نو‘‘ ہے) اور جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے ’’تیر و نشتر‘‘ اور ’’تکلّف برطرف‘‘ کا مطالعہ مفید ہے!

اس پورے سلسلہ تنقید میں چند باتیں بالکل نمایاں ہیں۔

ایک یہ کہ ان میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی ''جذبۂ اصلاح'' اور ''ہمدردانہ خیرخواہی'' کا وجود نہیں ملتا۔ یہ ایک تیز و تند طنز و مزاح کا سرمایہ ہے جو ادبی اعتبار سے چاہے کتنا ہی وقیع ہو لیکن ان جذبات کے لحاظ سے قطعی طور پر تہی دامن ہے جس کی تعلیم ہمیں اسلام دیتا ہے۔ (حیرت ہوتی ہے کہ وہی نعیم صدیقی صاحب جو ''چراغِ راہ'' کے اوراق میں اس طرح کے مضامین کے انبار لگاتے ہیں' جب ''ترجمان القرآن'' کے اشارات تحریر کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کے قلم سے ''تنقید'' کے موضوع پر اسلامی تعلیمات کا ایسا جامع مرقع نکلتا ہے کہ جسے دیکھ کر بے اختیار صاحب مضمون کے حق میں دعائے خیر نکلتی ہے۔)

دوسرے یہ کہ پورے معاشرے کی خرابیوں کا اندراج ''برسرِ اقتدار گروہ'' کے

نامہ اعمال میں کر دیا جاتا ہے۔ ع ''پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق!'' کی طرح اگر کہیں خدا کے ہاں یہ مضامین جو برسر اقتدار گروہ کی شان میں لکھے گئے ہیں' ان کے محاسبے کی بنا قرار دے دیے جائیں تو ان کو جہنم کا سب سے نچلا حصّہ بھی قبول کرنے سے انکار کر دے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ طرزِ معاشرت' یہ اخلاق' یہ بے حیائی اور یہ بے پردگی اور ناچ اور گانا اور یہ رقص و سرود کوئی ایک دن میں نہ پیدا ہو گئے تھے' نہ کیے جا سکتے تھے۔ یہ ایک صدی کی انگریز کی غلامی اور صدیوں کے انحطاط کا نتیجہ تھے اور قوم کے اس پورے طبقہ میں موجود تھے جو پڑھا لکھا' تعلیم یافتہ' مختلف محکموں (فوجی اور سول) کی جان اور پاکستان کی انتظامی مشینری کی روحِ رواں تھا۔ اب کیا آپ ''برسرِ اقتدار گروہ'' سے مراد ان سب کو لیتے تھے؟ اگر ایسا ہے تو کیا آپ کو اس بات کا امکان بھی نظر آ سکتا تھا کہ اس کو ''انتخابات'' کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے ----- اور اگر ایسا نہیں تھا تو پھر ان سب کے گناہوں کا بوجھ ''برسر اقتدار گروہ'' کے کندھوں پر کیوں ڈالا جا رہا تھا؟ صحیح طریقہ یہ تھا کہ اس طرز تنقید کے بجائے ان خرابیوں کی وجوہات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس طرح آپ کے دلوں میں ان کے لیے بے رحمی کی بجائے ہمدردی پیدا ہوتی۔ اور یہ نہ ہوتا تو کم از کم آپ ایک گروہ کو ساری خرابیوں کا ذمہ دار تو نہ ٹھہرا دیتے!

٭ تنقید کا دوسرا حملہ اس طرح تھا کہ: یہ لوگ نا اہل ہیں۔ پاکستان کی تمام مشکلات کی جڑ یہی ہیں اور ان میں پاکستان کے مسائل حل کرنے کی سرے سے کوئی صلاحیت اور قابلیت موجود نہیں ہے۔ یہ بات کسی حد تک صحیح ضرور تھی لیکن اس کو بہت زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا اور یہ لے اس حد تک بڑھی کہ جماعت کے ''ناقدین'' کا یہ حال ہو گیا کہ کہیں کوئی خرابی نظر آئی تو الزام ''برسر اقتدار گروہ'' پر ----- کہیں کوئی نقص پیدا ہو گیا تو ذمہ داری ساری کی ساری ''قیادت'' کی ----- اور پاکستان کی تمام مشکلات اور مصائب کی جڑ بس ایک قیادت کی نا اہلی! حالانکہ فی

الحقیقت پاکستان کے مسائل کےپیدا ہونے میں اس گروہ کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور عوامل کو بھی دخل تھا (مثلاً تقسیم ہند کا عجیب و

غریب ڈرامہ اور نقشہ' پاکستان کے وسائل کی کمی وغیرہ) اور پاکستان کی مشکلات کا حل نہ ہو پانے میں اس گروہ کی نا اہلی کے ساتھ ساتھ ان مسائل کی واقعی دِقّت اور شدّت کو بھی دخل تھا۔ آپ تنقید ضرور کرتے' یہ آپ کا سیاسی اور قومی حق تھا' لیکن از روئے انصاف دوسرے عوامل کے حصے کا بوجھ بھی اس گروہ کے سر منڈھ دینا تو کسی طرح صحیح نہ تھا۔ یہ بے رحمانہ تنقید مسلسل جاری رہی ----- اور اس میں اس جماعت کے ادنیٰ کارکنوں سے لے کر اس کے چوٹی کے لیڈروں تک سب نے برابر کا حصّہ لیا۔ اس ''تنقید'' کے علاوہ اس پورے عرصہ میں ''انقلابِ قیادت'' کے لیے کوئی اور کام ہوا ہی نہیں جس کا تذکرہ کیا جائے۔ پنجاب کے test کے بعد سرحد اور بہاوّل پور میں دو چھوٹے چھوٹے میچ اور ہوئے لیکن ان کے نتائج بھی وہی تھے جو پنجاب میں ظاہر ہوئے تھے (بلکہ اس سے بدتر!)۔ نتائج کا جائزہ آگے آرہا ہے!!

نتائج اور میزانیۂ نفع و نقصان

(۱)

جماعت اسلامی کی دستوری جدّوجُہد کا نتیجہ دستور پاکستان کی ''اسلامی دفعات'' ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اسلامی نے اظہارِ اطمینان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے ذریعے وہ کم سے کم شرائط پوری ہو گئی ہیں جو دستور پاکستان کو ''اسلامی'' بنانے کے لیے ناگزیر تھیں۔

قانونی حیثیت سے تو شاید یہ بات درست ہو لیکن حقیقی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دستور میں چند سطحی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس دستور کی نام نہاد اسلامیت زیادہ تر بس اوپری اور سطحی چیزوں تک محدود

ہے۔ مثلاً:

- ریاست پاکستان کا نام ''جمہوریہ اسلامیہ پاکستان'' ہو گا۔
- صدر مملکت کا مسلمان ہونا لازم ہو گا۔
- یا پھر چند چیزیں ہیں جو ''راہنما اصولوں'' میں آئی ہیں، لیکن دستور میں ان کی عملی

تاثیر ہوتی ہی کیا ہے!
operative clauses میں لے دے کر ایک دفعہ ہے کہ جس میں ''قرآن و سُنّت'' کے خلاف قانون سازی کو ممنوع قرار دیا گیا ----- لیکن اس کے لیے بھی جو procedure طے کیا گیا ہے اس نے اسے مفلوج اور بے کار بنا کر رکھ دیا ہے!
اور یہ وہ کُل ''اسلامی دفعات'' ہیں جن کی رو سے دستور کو ''اسلامی دستور'' قرار دے کر اسے ''اسلام کی فتح'' اور ''عوامی طاقتوں کی کامیابی'' قرار دیا جا رہا ہے۔
یہاں دو باتیں قابلِ غور ہیں:
ایک ----- یہ کہ آخر جماعت نے اسے قبول کیوں کیا؟
دوسرے ----- یہ کہ آیا نو سال کی جدّوجُہد کا یہ ثمرہ اتنا وقیع ہے کہ اس کے لیے اس قدر طویل جدّوجُہد justified سمجھی جا سکے اور یہ باور کیا جا سکے کہ جس طریق کار کو ۱۹۴۷ء میں اختیار کیا گیا تھا وہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور قابلِ اطمینان نتائج پیدا کر رہا ہے؟
جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، صاف نظر آتا ہے کہ جماعت نے اس دستور کو اس کے "merits" پر نہیں بلکہ اپنی ''مجبوری'' کے باعث قبول کیا ہے۔ در اصل حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے اور جماعت اب اس قدر بے چارہ ہوئی جا رہی تھی کہ جو کچھ بھی مل رہا تھا اس پر قناعت کر لینا اور اسے غنیمت سمجھ لینا پڑا۔ اس مقام پر جماعت اسلامی اور اس کی قیادت پر وہ تبصرہ ٹھیک ٹھیک صادق آتا ہے جو آٹھ سال قبل مولانا مودودی

صاحب نے مسلم لیگی قیادت پر کیا تھا (ملاحظہ ہو اقتباس بر ص۱۱۵)۔ جس طرح سلطان عبد الحمید خاں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ تیس سال تک دول یورپ کی آپس کی آویزش کے سہارے جیتے رہے اور مسلم لیگ کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ صرف انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتی رہی بالکل اسی طرح یہ واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اس پورے دَور میں برسرِ اقتدار گروہ کی چپقلش اور باہمی آویزش و تصادم کے سہارے جینے کی کوشش کی۔ اگرچہ جماعت اس پورے دَور میں دستور کے مسئلے پر

حاصل کردہ پے در پے ''کامیابیوں'' کو سراسر عوامی جدّوجُہد کا نتیجہ اور اپنی مساعی کا ماحصل قرار دیتی رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام کامیابیوں میں کہ جو جماعت کو ان لوگوں کے مقابلے میں حاصل ہوئیں' جماعت کی اپنی قوت و طاقت سے زیادہ ان کی آپس کی ناچاقیوں اور پارٹی بازیوں کو دخل ہے! اس بات کا اعتراف خود جماعت کے اکابرین کی طرف سے مسرت اور اطمینان کے ان ملے جلے جذبات کی شکل میں ہوتا رہا ہے کہ جو ''شیطان کی اس ٹولی'' کے باہمی تنازعات پر ظاہر کیے جاتے رہے۔ اس کا مظاہرہ ایک جگہ تو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے۔ ''ترجمان القرآن'' بابت مئی ۱۹۵٦ء میں مولانا مودودی صاحب نے پاکستان میں صورت حال سے جو مایوسی پیدا ہوتی جا رہی تھی اس کو دُور کرنے کے لیے چند ''حقائق'' بیان کیے ہیں ''جنہیں نگاہ میں رکھنے سے'' مولانا کی رائے میں یاس کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید کی شعاعیں چمکنی شروع ہو جاتی ہیں... ان چار حقائق میں سے کہ جو اس سلسلے میں بیان ہوئے ہیں' حقیقت نمبر ۳ یہ ہے کہ:

''بگاڑ کے لیے کام کرنے والوں کو سب کچھ میسّر ہے مگر دو چیزیں میسّر نہیں ہیں: ایک سیرت و کردار کی طاقت' دوسرے اتحاد و اتفاق...''

''... حقیقت میں یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کے دلوں میں نفاق کو ڈال کر انہیں آپس میں لڑا دیا ہے۔ خیر کی راہ اب تک بھی اسی شگاف سے نکلی ہے اور آئندہ بھی یہ شگاف جتنا وسیع ہوتا جائے گا' خیر کا رستہ بھی کشادہ ہوتا چلا جائے گا!''

پھر یہ بات جس طرح ان کے بارے میں صحیح تھی کہ انہوں نے اپنی طاقت بنانے کی کوشش نہ کی اور سارا انحصار صرف مدّ ِ مقابل گروہ کے اختلاف پر کیا' اسی طرح جماعت کے بارے میں بھی صحیح ہے کہ اس نے بھی دستور کے مطالبات تو پیش کیے اور اس کے لیے لوگوں سے دستخط بھی کرائے اور انگوٹھے بھی لگوائے لیکن خود ان عوام کی اخلاقی و دینی تربیت اور ان کی سیاسی تنظیم کی طرف کوئی توجّہ نہ کی کہ کسی موقع پر وہ قوت کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے مطالبے کو منظور کرا سکتے۔ نہ صرف یہ کہ ''عوام'' میں اس پورے عرصے میں کوئی ''طاقت'' پیدا نہ ہو سکی بلکہ خود جماعت میں جس قدر دم خم تھا اور جتنی قوتِ کار تھی'

اسے بھی نہ صرف یہ کہ بڑھایا نہ جا سکا بلکہ برقرار بھی نہ رکھا جا سکا۔ چنانچہ جب اصل ''تصادم'' کا وقت آیا تو جس طرح ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کا وقت آجانے پر مسلم لیگ نے اپنے آپ کو ہوا میں کھڑے ہوئے پایا تھا' اسی طرح جماعت اسلامی نے محسوس کیا کہ نیچے سرے سے وہ قوت ہی موجود نہیں ہے جسے میدان میں لایا جا سکے۔

گزشتہ سال جب فوجی آمریت کا خطرہ سامنے آیا تھا تو جماعت نے اپنا پوری طرح جائزہ لے لیا تھا کہ ''من آنم''----- اور اس سال جب دستور اپنے آخری مراحل میں داخل ہوا تو جماعت کو جو کچھ بھی مل گیا اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرنا پڑا -----اسے رد کر کے مزید کا مطالبہ کرنے کی سکت آخر کہاں تھی؟ اس بات کو پوری طرح appreciate کرنے کے لیے ذرا ان تقریروں کو ذہن میں مستحضر کیجیے کہ جو ۱۹۵۲ء میں ''دستوری ہفتوں'' کے دوران لاہور میں نعیم صدیقی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اور کراچی میں مولانا مودودی صاحب نے کی تھیں۔ ان میں ''انتباہات'' اور warnings کی شدّت کا تصوّر کیجیے اور اس خود اعتمادی اور ''زعم قوت'' کو ذہن میں تازہ کیجیے جو ان تقاریر میں پائی جاتی تھیں -----اور اس کسمپرسی اور بے چارگی کو دیکھیے کہ جو ۱۹۵۵ء میں جماعت پر طاری تھی تو حیرت ہوتی کہ محض تین سال میں جماعت اسلامی پاکستان ''از کجا'' ''تا بہ کجا'' آ چکی تھی۔

رہی دوسری بات یعنی یہ کہ آیا دستوری جدّوجُہد کے یہ نتائج اتنے وقیع ہیں کہ ان پر اطمینان کیا جا سکے تو اس کے سلسلے میں دو باتوں کو بھول جانا ایک عظیم غلطی ہو گی۔

ایک یہ کہ اس دستور میں اوّل تو کچھ ہے ہی نہیں ----- ! اور

دوسرے یہ کہ جو کچھ ہے وہ سخت نا پائیدار ہے۔

یہ دوسری بات بہت اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے۔ دستور میں جیسی کچھ اسلامی دفعات بھی شامل ہوئی ہیں ان کی وقعت بھی اس صورت میں بہت زیادہ ہوتی جبکہ وہ ''از خود'' ایک فطری طریق پر شامل دستور ہوئی ہوتیں۔ اس صورت میں یہ خود اپنی قوت پر قائم رہنے کے قابل ہوتیں لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ ''یہ آئی نہیں لائی گئی ہیں!'' اور ان کا

شامل دستور ہونا ایک بالکل غیر فطری طریق پر ہوا ہے۔ لہٰذا ان کا دستور میں باقی رہنا خود ان کے بس میں نہیں ہے بلکہ یہ ان حالات اور عوامل کے برقرار اور برسرپیکار رہنے پر منحصر ہے' جو ان کو وجود میں لانے کے موجب ہوئے ہیں۔

دستور کی یہ اسلامی دفعات عوام کی خواہشات کی تو شاید عکاسی کرتی ہوں لیکن ان کی حقیقی کیفیات

(نظری و عملی) کا پرتو نہیں ہیں۔ ان کی جڑیں زیادہ سے زیادہ مسلمان عوام کی خواہشات ہی میں قائم ہیں۔ ان کے دلی احساسات و جذبات' ان کے حقیقی نظریات و افکار اور ان کے واقعی اخلاق و کردار میں گہری اتری ہوئی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ دستور کو اسلامی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ایک مصنوعی اسلامی دستور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مولانا مودودی صاحب نے ''مطالبۂ نظام اسلامی'' میں فرمایا تھا..... ''یہاں ایک مصنوعی انقلاب برپا ہوا ہے (مراد ہے قیام پاکستان)۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی بلکہ انقلاب کے فوراً بعد آپ سے آپ ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی !'' -----بعینہٖ وہی صورت حال اس دستور اسلامی کی ہے ! یہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک مصنوعی اسلامی دستور ہے۔ اگر یہ فطری طور پر وجود میں آیا ہوتا تو آپ سے آپ قائم رہتا۔ لیکن اب ہر وقت اس بات کا خطرہ ہے کہ ایک ہی ردِّ عمل (counter revolution) اسے تنکے کی طرح بہا کر لے جائے۔ اِلا یہ کہ جس طرز کی جدّوجُہد نے اسے جنم دیا ہے' وہ اسی طرز اور اسی پیمانے پر جاری رہے -----اور اس کا امکان اب بے حد کم ہے !

اب اس کے پس منظر میں وہ نو سالہ جدّوجُہد رکھیے جو جماعت نے ان اسلامی دفعات کے حصول کے لیے کی ہے تب اس طویل جدّوجُہد کا ''میزانیۂ نفع و نقصان'' مرتب ہو گا۔ ایک تحریک کے نو سال کوئی معمولی چیز نہیں ہوتے۔ اس عرصہ میں تو تحریکیں اتنا کام کر لیتی ہیں جو آئندہ کے لیے فیصلہ کن ثابت ہو۔ لیکن یہاں اس کے باوجود کہ جماعت اسلامی کی اکثر و بیشتر مساعی اسی ایک کام پر صرف ہوئی ہیں' اس سلسلے میں ہاتھ جو کچھ آیا ہے وہ اس قدر حقیر ہے کہ سارا کھیل سراسر زیاں کاری نظر آتا ہے۔ اوّل تو جو کچھ حاصل ہوا

ہے وہ ''کمیت'' کے اعتبار سے بہت قلیل ہے اور پھر اس کی بھی ''کیفیت'' یہ ہے کہ کسی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اسے بہا لے جا سکتا ہے۔ اس خسارے اور ٹوٹے کا کہ جو جماعت کو نو سالہ جدّوجُہد کے اس سودے میں اٹھانا پڑا ہے' صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اس میں کھویا کیا کچھ ہے۔ اس میں نو سال کی مساعی ہی صَرف نہیں ہوئیں' جماعت کو اور بھی بہت کچھ ہاتھ سے دینا پڑا ہے (اور اس کا تذکرہ آئندہ آ رہا ہے) اور یہ سب کچھ دے دلا کر جو کچھ حاصل ہوا' وہ دستور کی ''چند'' ''نام نہاد'' اور ''متزلزل'' دفعات کے سوا اور کچھ بھی نہیں----- فَاعتَبِرُوا یَا اُولِی الاَ بْصَار !

اور یہ براہ راست نتیجہ ہے محض اس بات کا کہ اس اصولی اور فطری طریق کار کو چھوڑ کر کہ جو جماعت کی تاسیس کے وقت اختیار کیا گیا تھا' ۱۹۴۷ء میں ایک ایسا طریق کار اختیار کر لیا گیا جو بالکل خلافِ فطرت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے قطعاً غیر مفید تھا !

(۲)

نو سالہ جدّوجُہد کی پہلی شق میں تو خواہ ''بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی'' تھوڑا بہت کچھ تو حاصل ہوا' لیکن شق دوم پر تو سوائے ہاتھ سے کچھ دینے کے حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔

انتخاباتِ پنجاب کے بعد لے دے کر ایک چیز کو کامیابی قرار دیا گیا تھا اور وہ یہ کہ ہم نے اپنے اصول کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ قطع نظر اس سے کہ تیس سیٹوں پر کامیابی کی امیدیں رکھنے کے بعد اس اصول پرستی کو بھی ''کامیابی'' قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں----- اسے ''کامیابی'' مان لیا جائے تب بھی اس کامیابی کی عمر زیادہ طویل نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصے بعد بہاوَل پور کے انتخابات میں ''اصول پسندی'' کی تہمت کو بھی اتار پھینکا گیا----- انتخابی کنڈکٹ رولز کی خلاف ورزیاں اس دلیل کے ساتھ کی گئیں کہ جب اور لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور حکومت انہیں نہیں روکتی تو اس سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ یہ رولز خود حکومت نے defunct کر کے رکھ چھوڑے ہیں ----- وغیرہ وغیرہ ----- لہٰذا اگر

''کامیابی'' اس چیز کو بھی کہا جا سکتا تھا جسے ۱۹۵۱ء میں کہا گیا تھا تو وہ چیز بھی جماعت اپنے ہاتھ سے دے بیٹھی۔

باقی جہاں تک کامیابی کا باصطلاح معروف تعلق ہے اس کے لحاظ سے ----- اگر جماعت اپنی اصول پسندی کو برقرار رکھے اور انتخابی پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہ کردے----- آج ہم ۱۹۵۱ء سے بھی کہیں پیچھے چلے گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسی طریق کار اور اسی پالیسی کے تحت الیکشنز میں حصّہ لیا جائے تو آج جماعت اسلامی کو اتنے ووٹ بھی نہ ملیں جتنے ۱۹۵۱ء میں مل گئے تھے !

جو کچھ حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا اس کا تو عُشرِ عشیر بھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ اس سلسلے میں جو نقصان اپنی اس پالیسی کی وجہ سے ہم نے پاکستانی قوم کو بحیثیت قوم اور پاکستان کو بحیثیت ملک پہنچایا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

پاکستان کے معاملات کی باگ ڈور ابتداءً جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی تھی اگرچہ جماعت کی طرف سے تنقید

کرتے ہوئے انہیں ہمیشہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا رہا ہے لیکن واقعتاً وہ سب بالکل ایک ہی طرح کے لوگ نہ تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد اگرچہ ایسے پیشہ ور سیاستدانوں کی تھی جو کسی بھی اصول سے نا آشنائے محض تھے لیکن ان میں ایک اچھی بھلی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی کہ جن کو ہم واقعی قوم پرست کہہ سکیں اور جو قومیت کے ''مخلصین'' شمار کیے جا سکیں۔ اور خوش قسمتی سے ابتداءً ایسے ہی لوگوں کو اس قیادت میں اصل قوت و مرکزیت حاصل تھی۔

اس قیادت کی صفوں میں انتشار اور تفرقہ بازی کا رونما ہونا ایک بالکل فطری اور لازمی امر تھا اور جب یہ انتشار رونما ہونا شروع ہوا تو اس قیادت کو بیک وقت دو حملوں کا سامنا کرنا پڑا -----ایک داخلی انتشار اور ----- دوسرے بیرونی تنقید و مخالفت' جس کی چیمپئن جماعت اسلامی تھی۔

جماعت اسلامی تو یہ سب کچھ اس غرض سے کر رہی تھی کہ وہ ''خلا'' پیدا ہو جسے ''صالح قیادت'' سے پر کیا جائے لیکن عملاً نادانستہ طور پر وہ ان لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط

کرنے کا ذریعہ بن گئی جو پاکستان کی ''قومی قیادت'' کو تارپیڈو کر کے اپنے لیے میدان صاف کر رہے تھے۔ چنانچہ جب بھی قیادت میں کوئی خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کے لیے اکثر و بیشتر پہلے سے بھی بدتر لوگ آگے آئے ----- اور نا سمجھی میں جماعت یہ سوچ کر مطمئن ہوتی رہی کہ اس طرح ''صالح قیادت'' کے لیے راہ ہموار ہو رہی ہے۔ چنانچہ قومی قیادت کے ہر ستون کے گرنے پر جماعت نے یہ محسوس کیا کہ ''صالح قیادت'' کے برپا ہونے کے امکانات روشن تر ہو گئے ----- حالانکہ فی الواقع بد سے بدتر قسم کے لوگوں کے لیے آگے آنے کا راستہ صاف ہو رہا تھا۔

پاکستان کی قومی قیادت کا ''ستونِ اعظم'' تو جلد ہی اللہ تعالیٰ کے بلاوے پر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

خان لیاقت علی خان میں لاکھ خرابیاں اور خامیاں سہی لیکن یہ اس کے بدترین دشمن بھی تسلیم کریں گے کہ وہ ''قوم کا مخلص'' ضرور تھا' لیکن اس پر جس بے رحمانہ انداز میں مسلسل تنقید کی گئی' اس نے ''صالح قیادت'' کے آگے آنے میں تو کوئی مدد نہ کی البتہ ان لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کر دیا جو اُس کی مضبوط گرفت سے آزاد ہو کر ملک میں من مانی کرنا چاہتے تھے!

اور یہ تو اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ جماعت اسلامی نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو بھی ان کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران اپنی تنقید سے بچ کر جانے نہ دیا۔ ع

''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!''

(حالانکہ ان کی وزارت کے برطرف ہو جانے کے بعد ان کے خلوص کا اعتراف کیا گیا) ----- حتیٰ کہ نادانستہ طور پر جماعت ان کے خلاف بعض علماء اور کچھ اہلِ سیاست کی ناپاک سازش میں استعمال ہو گئی۔

اس سارے طریق کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ صالح قیادت تو بروئے کار نہ آنی تھی نہ آئی' البتہ قومی قیادت کے کمزور کرنے میں جماعت کی مساعی بھی شامل ہو گئیں۔ ''تعمیر'' کے بارے میں جو خواب دیکھے گئے تھے وہ نہ پورے ہو سکتے تھے نہ ہوئے لیکن ''تخریب'' کے لیے جو مساعی کی گئی تھیں وہ ان لوگوں کے کام آگئیں کہ جن کے پیش نظر سوائے اپنی

ذاتی منفعت اور مفاد کے اور کچھ نہ تھا۔

اور آج (۲۸) جو یہ صورتِ حال پیش آگئی ہے کہ ایک ایسی قیادت ملک میں برسرِ کار آگئی ہے کہ جو پاکستان کے بنیادی نظریے سے بھی اختلاف کرتی ہے اور جس کے اوپر آجانے سے خود جماعت اسلامی ان خدشات کا اظہار کر رہی ہے کہ پاکستان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا ہے تو اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی ذمہ داری سے جماعت اسلامی بھی کسی طرح بچ نہیں سکتی۔

رنگِ جدید

گزشتہ بحث میں صرف ان نتائج کا جائزہ لیا گیا ہے کہ جو براہ راست دو نکاتی پروگرام پر جدّوجُہد سے نکلے' ورنہ طریق کار میں اس اصولی اور بنیادی تبدیلی کے نتائج جو ۱۹۴۷ء میں کی گئی تھی ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ نتائج جماعت کے ایک ایک شعبے میں رونما ہوئے ہیں اور انہوں نے مل جل کر جماعت کی ایک بالکل ہی نئی شبیہہ بنا دی ہے' جو دَورِ اوّل کی شبیہہ سے بالکل مختلف ہے۔ ؎

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ

اب میں ذرا ان اثرات کا جائزہ لوں گا جو طریق کار کی اس تبدیلی سے جماعت کے کارکنوں اور جماعت کی ان خصوصیات پر مترتب ہوئے جو دورِ اوّل کا طرۂ امتیاز تھیں۔

اس سلسلے میں کارکنوں کے اندر دورِ اوّل کی چار خصوصیات کے بالکل برعکس جو خصوصیات دورِ ثانی میں پیدا ہوئی ہیں وہ حسب ِذیل ہیں:

نو مسلمانہ احساس کا خاتمہ

صاف نظر آتا ہے کہ وہ نو مسلمانہ احساس جو دورِ اوّل کے کارکنوں کی اہم خصوصیت تھی آج بالکل مفقود ہے اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ جب نسلی اور قانونی اسلام اور اصلی

_____(۲۸) خیال رہے کہ یہ تحریر ۱۹۵۶ء کی ہے!

اور حقیقی ایمان کے درمیان تمیز کرنا ہی چھوڑ دیا گیا اور تمام مسلمانوں کو ''مسلمان'' فرض کرکے مسلسل نو سال کام کیا گیا تو خود اپنے ایمان و اسلام کی عامۃ المسلمین کے ایمان و اسلام سے کسی قدر علیحدہ نوعیت کا احساس بھی ختم ہو ہی جانا چاہیے تھا! اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہوا۔ جماعت کی رکنیت اختیار کرنے کا پروسیجر آج بھی اگرچہ ظاہراً وہی ہے کہ جو دورِ اوّل میں تھا لیکن دورِ ثانی میں رکن بننے والوں کے احساسات ہرگز اس قسم کے نہیں ہوتے جن کا سراغ دورِ اوّل میں ملتا ہے۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ جماعت میں داخلے کے وقت لوگوں کے احساسات اب بالکل کسی سیاسی جماعت میں داخلے ہی کی طرح کے ہوتے ہیں لیکن یہ بھی بہر حال حقیقت ہے کہ وہ اس قسم کے احساسات کسی صورت میں نہیں ہوتے جو دورِ اوّل میں پائے جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ''جماعت کے لوگ بس اپنے آپ ہی کو مسلمان سمجھتے ہیں باقی کسی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے!'' کا اعتراض جو دورِ اوّل میں جماعت پر اکثر کیا جاتا تھا' اب کسی طرف سے سننے میں نہیں آتا۔ اس اعتراض

کےپیدا ہونے کی اصل وجہ وہ احساس تھا جو اپنے اور دوسروں کی کیفیت ِایمان و اسلام میں جماعت کا ہر فرد محسوس کرتا تھا۔ آج جب اس فرق کو جماعت کے لوگ ہی محسوس نہیں کرتے تو دوسروں کو وہ کہاں سے محسوس ہو!

سیرت و کردار کا انحطاط

پھر یہ معاملہ ''احساس'' ہی کا نہیں ''صورتِ واقعہ'' کا بھی ہے۔ ارکانِ جماعت کی زندگیاں عملاً اب وہ معیار پیش نہیںکرتیں جو دورِ اوّل کے ارکان کی زندگیاں پیش کرتی تھیں۔

* ''سیرت و اخلاق و کردار'' کا سرمایہ جو کسی انقلابی جماعت اور خصوصاً اسلامی جماعت کی اصل قوتِ تسخیر ہوتا ہے' اب رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم ہونے پر آ رہا ہے۔ وہ نمایاں فرق جو جماعت کے اندر اور اس کے باہر کے لوگوں کی زندگیوں میں نظر آتا تھا 'اب مدہم پڑتے پڑتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اگرچہ اب بھی یہ فرق موجود ہے لیکن اس کی مقدار اتنی کم ہو چکی ہے کہ دورِ اوّل کے مقابلے میں اسے ''عدم'' ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

جماعت کے عام ارکان ہی نہیں اس کے بڑے بڑے لوگوں کے ''معاملات'' بھی عوام میں زیر بحث آ کر پوری جماعت کو بدنام کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ لین دین کرتے ہوئے اب وہ اعتماد جماعت کے اراکین آپس میں ایک دوسرے پر بھی نہیں کر سکتے کہ جو دورِ اوّل میں جماعت کے باہر کے لوگ بلا تکلّف جماعت کے لوگوں پر کر لیا کرتے تھے -----غرض وہ زبردست ''اخلاقی وقار'' جو جماعت نے اپنے دورِ اوّل میں پورے ماحول پر قائم کر دیا تھا' اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

* اب ''تصادم'' اور ''کشمکش'' کی وہ کیفیت بھی کہیں نظر نہیں آتی جو دورِ اوّل میں جماعت کے ہر فرد اور اس کے آس پاس کے ماحول میں نظر آتی تھی۔ اس کے برعکس ماحول کے ساتھ ''تعاضد'' و ''تناصر'' کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ کہاں وہ کیفیت تھی کہ ایک شخص جماعت کا رُکن بنا نہیں کہ اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور اس کے اپنے گھر اور خاندان سے لے کر پورے معاشرے کے ساتھ چومکھی جنگ کا محاذ قائم ہو گیا! کہاں اب یہ حالت ہے کہ لوگ جماعت کے رُکن بن جاتے ہیں لیکن پھر بھی کہیں کوئی کشمکش یا تصادم نظر نہیں آتا ----- اس کی وجہ یہ تو بہر حال نہیں ہے کہ اب ماحول پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ ماحول تو پہلے سے بھی پست ہی ہوا ہے۔ اس میں ''دین'' کا عنصر اور اس کا تناسب پہلے کی نسبت کم اور بے دینی کا تناسب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اس کے اخلاق و کردار کا معیار پہلے کے مقابلے میں کہیں نیچے جا چکا ہے -----بلکہ یہی اور صرف یہی ہے کہ اب خود جماعت کے ارکان کا دینی و اخلاقی معیار اپنی پہلی سطح سے گر کر عوام الناس کی سطح تک آ چکا ہے۔

جوشِ کار اور جذبۂ ایثار میں کمی

پھر ''جوشِ کار'' اور ''جذبۂ ایثار'' کا جو عالم اب جماعت کے ارکان میں پایا جاتا ہے' اس نے تو پوری

جماعت میں تشویش کی ایک لہر دوڑا دی ہے۔ وہ تمام اچھے اچھے کارکن جو کسی زمانے میں ایثار کے مجسمے اور ہمت و عزیمت کے پتلے ہونے میں اپنی مثال آپ تھے' ایک ایک کر کے سرد مہری کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جماعت میں ''رخصت'' کی

ایک عام وبا پھیل گئی ہے۔ ''معذرت'' اور پھر نری معذرت بھی نہیں ''عذر شرعی'' کا معیار اب اس درجہ پست ہو گیا ہے کہ بالکل معمولی معمولی کاموں اور ذرا ذرا سی مصروفیتوں کے باعث جماعت کے اہم ترین کاموں سے استثناء کی درخواست دائر کر دی جاتی ہے' بلکہ درخواست تو دور کی بات ہے اکثر و بیشتر بعد میں معذرت موصول ہوتی ہے۔

اور یہ کیفیت صرف ان لوگوں میں نہیں ہے جو بعد از تقسیم رُکن بنے ہیں' بلکہ ان میں بدرجۂ اوّلیٰ و اتم ہے جو تقسیم سے قبل رُکن بنے تھے اور جماعت میں ''سابقون الاوّلون'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعد کے رکن تو پھر بھی ----- خواہ بدلے ہوئے تصوّرات اور کچھ نئے محرکاتِ عمل کے تحت ہی سہی-----کسی قدر فعال نظر آتے ہیں لیکن ان ''سابقون الاوّلون'' کی کیفیت تو اکثر و بیشتر اس طرح کی ہے کہ سر پر سوار ہو کر کوئی کام نکلوا لو تو شاید ہو جائے' از خود ان کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ جائزہ کمیٹی سے ملاقات میں مَیں نے منٹگمری کے آس پاس کے چند لوگوں کی مثال نام لے کر پیش کی تھی۔ یہاں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں۔ اس حلقہ میں جماعت اسلامی کے جو پرانے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے:

ایک ... صاحب ہیں' ان کے بارے میں عام اراکین اب برملا یہ کہتے ہیں کہ ان میں نہ وہ پرانا جوش کار ہے اور نہ جذبۂ ایثار' حتیٰ کہ مالی اعانت کا معاملہ بھی اب کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے !

دوسرے ... صاحب ہیں جن کے ایثار اور جذبۂ کار کو جماعت میں اس سے پہلے ایک قابل تقلید مثال کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا۔ آج ان کی کیفیت یہ ہے کہ وقت کا تو سوال ہی نہیں ' ایک مالی اعانت ہے جو وہ کر دیتے ہیں لیکن اس کی کیفیت بھی یہ ہے کہ قیم حلقہ خود ان کے گاؤں جا کر سر پر سوار ہو کر کچھ نکلوا لائیں تو ''حق محنت'' وصول ہو جاتا ہے' از خود مالی اعانت بھی نہیں کرتے اور حال یہاں تک آپہنچا ہے کہ نصف درجن خطوط دفتر حلقہ سے ارسال کیے جائیں تو ایک کا جواب موصول ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

تیسرے جناب ... صاحب ہیں۔ ان کی کیفیت ان دونوں حضرات سے بھی گئی گزری ہے۔

چوتھے جناب شیخ ... صاحب ہیں جن کا معاملہ سب سے دگرگوں ہے۔ وہ جماعت ... کے رکن تھے لیکن وہاں کے دوسرے ارکان نے ان کی سرد مہری سے تنگ آکر بالآخر اس بات سے فائدہ اٹھایا کہ ان کا قیام شہر سے ''ایک میل'' دور ہے اور تجویز کیا کہ ان کو ایک منفرد رکن بنا دیا جائے' تاکہ مقامی جماعت کا پیچھا ان سے چھوٹ جائے۔ پورے شہر... میں' خصوصاً ان حلقوں میں کہ جن کا ان سے کاروباری تعلق ہے' وہ انتہائی بدنام ہیں اور کہیں سے کوئی کلمۂ خیر ان کے حق میں سننے میں نہیں آتا۔

پانچویں حافظ ... صاحب ہیں جو کہ ایک طویل عرصے تک بالکل تعطل کی سی کیفیت میں رہے ہیں۔ اب پھر ذرا فعال ہوئے ہیں' لیکن وہ پہلی سی کیفیت ان میں اب بھی نظر نہیں آتی۔

یہ ان لوگوں کا حال ہے جن میں ایک ایک پہلے سینکڑوں پر بھاری تھا۔ نئی بھرتی کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے صرف وہی لوگ کام کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں کہ جنہیں کام کا کوئی معاوضہ بھی دیا جاتا ہو۔ ان ''تنخواہ یافتہ'' لوگوں کے علاوہ کوئی کام کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتا ہے۔ اور یہ با معاوضہ کام کی لے اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی کاموں کے لیے بھی بلا معاوضہ خدمات دستیاب نہیں ہوتیں' با معاوضہ ہی کام کرانا پڑتا ہے۔

قبل از تقسیم کی یہ کیفیت کہ بس ''اقامت ِدین'' ہی کی دُھن اور اسی کی لگن اس تحریک کے کارکنوں کو ہوتی تھی' اسی کے لیے ان کا جینا تھا اور اسی کے لیے مرنا ----- اور اس کے لیے وہ بڑی سے بڑی ''زیاں کاری'' کو قبول کر لیتے تھے' اب کہیں نظر نہیں آتی (اِلّا ما شاء اللہ)۔ دنیا کے کاروبار میں انہماک روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنے کاروبار کی فکر اب زیادہ ستاتی ہے اور اس سے جو وقت بچ جائے زیادہ سے زیادہ اس کو پیش کیا جاتا ہے' اور نہ صرف یہ کہ اپنی طرز رہائش و بود و باش کا معیار بلند کر لیا گیا ہے اور اس کو برقرار رکھنے ہی پر اکثر و بیشتر مساعی اور صلاحیتیں صرف ہو جاتی ہیں بلکہ اب تو دنیا میں پھلنے پھولنے کی امنگیں زور کر رہی ہیں۔ مستقبل بنانے کی دُھن ذہنوں پر سوار ہے۔ کاروبار کی

ترقی اصل مرکز نگاہ ہے----- اور جماعت کا کام بس ثانوی ہو کر رہ گیا ہے ----- جو ہو جائے تو اچھا ہے----- نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔

مِن حیث المجموع اس وقت جماعت اپنے تنخواہ یافتہ کارکنوں کے سر پر کھڑی ہے۔ ذرا انہیں ایک مرتبہ ہٹا دیجیے' آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کا پورا ڈھانچہ کس طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ عام کارکنوں کے بل پر آپ ایک قدم حرکت نہیں کر سکتے۔ ہمہ وقتی کارکن اس وقت جماعت کی روحِ رواں ہیں -----کہاں تو وہ حالت تھی کہ تمام ارکان

ہمہ وقتی کارکن تھے‘ کہاں آج معدودے چند رہ گئے ہیں ----- اور وہ بھی کام ’’اقامت ِدین کی فرضیت‘‘ کے احساس سے زیادہ ’’ملازمانہ‘‘ احساسات کے تحت کرتے ہیں۔

مجھے اس پر حیرت نہیں ہے کہ یہ کیفیات کیوں پیدا ہو گئیں۔ ان کا پیدا ہونا فطری اور لازمی تھا۔ جو طریق کار ۱۹۴۷ء میں اختیار کیا گیا تھا اس نے جماعت کو پہلے تو ایک ’’انقلابی جماعت‘‘ کے مقام سے گرا کر ایک ’’قومی جماعت‘‘ بنایا اور پھر ’’قومی‘‘ سے بھی گرا کر ایک ’’سیاسی‘‘ جماعت بنا کر رکھ دیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے کارکنوں کے نقطہ ہائے نظر اور ان کی کیفیات کا بدلنا لازمی تھا۔ یہ کیفیت رونما ہوئی ہے تو اس میں حیرت و استعجاب اور چیخ و پکار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ حیرت ہوتی ہے تو اس امر پر کہ جماعت اسلامی کی قیادت کے سامنے جب یہ اثرات اور نتائج پیش کیے جاتے ہیں تو بڑے ہی تعجب اور حیرت کے ساتھ فرمایا جاتا ہے: ’’اچھا ! اب جماعت میں یہ بھی ہونے لگا ہے !‘‘ گویا کہ اس کا ہونا غیر متوقع اور ناگہانی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ صرف ایک ’’اسلوب بیان‘‘ ہے یا واقعتاً جماعت اسلامی کے قائد اس موٹی سی بات سے بے خبر ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہمارے موجودہ طریق کار کے فطری اور لازمی نتائج ہیں ----- اور حیرت پر مزید حیرت ہوتی ہے اس بات سے کہ ان باتوں پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ ضرورت جو محسوس کی جاتی ہے وہ اس بات کی ہے کہ ایک سرکلر شائع کر دیا جائے اور اس کے بعد ہماری قیادت اطمینان کے ساتھ اسی

رستے پر پھر چل کھڑی ہوتی ہے جس پر چلنے ہی سے یہ چیزیں پیدا ہوئی ہیں اور جس پر مزید چل کر ان میں اضافہ تو بہر حال کیا جا سکتا ہے‘ کمی کی کوئی صورت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ (۲۹)

محبّت اور اخوت کا فقدان

جماعت کے متعلقین کے آپس کے تعلقات بھی اب مایوس کن حد تک کمزور ہی نہیں بلکہ بعض جگہ پر تو افسوس ناک حد تک خراب ہیں۔

وہ تعاضد و تناصر‘ وہ ہمدردی اور باہمی امداد و تعان اور وہ خلوص اور محبت جو جماعت کے دَور اوّل میں اس کے کارکنوں کی ایک نمایاں خصوصیت تھی‘ اب کہیں نظر نہیں آتی۔ اور کہیں نظر آ جائے تو آج کے حالات میں ’’عجیب‘‘ معلوم ہوتی ہے۔ اب ان چیزوں کے فقدان کو جماعت کا ہر حساس شخص محسوس کر رہا ہے۔ ان چیزوں کی جگہ اب صرف سطحی سے میل جول‘ خشک اور اوپرے تعلقات اور ایک قانونی اور دلی جذبات سے عاری تعلق نے لے لی۔ دورِ اوّل کے ع

من تُو شدم تُو من شدی من تن شدم تُو جاں شدی

سے معاملات اب ع
تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

لی نوعیت اختیار کر چکے ہیں۔
اب دو ارکان کی آپس کی ملاقات کے موقع پر چہرے خوشی اور مسرّت سے تمتما نہیں

_____(۲۹) دوسری اسیری کے بعد ملتان جیل سے رہا ہونے پر جب مولانا مودودی صاحب نے دوبارہ امارت جماعت کا چارج سنبھالا تو ان کے علم میں کچھ باتیں لائی گئیں جو خصوصاً بیت المال کے معاملے میں جماعت کے لوگوں کی بے احتیاطیوں اور بے ضابطگیوں پر مشتمل تھیں۔ اس پر جو ردّ عمل مولانا کی جانب سے ظاہر ہوا وہ ایک سرکلر کی شکل میں تھا جو غالباً تمام اراکین جماعت کو دیا گیا تھا۔ اس کے مطالعے سے ہلکی سی امید پیدا ہوئی تھی کہ مولانا نے صورت حال کی نزاکت کا احساس کر لیا ہے اور اب ان شاء اللہ کوئی نہ کوئی تبدیلی اور طرز عمل میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور واقع ہو گا---- لیکن بس اس ایک سرکلر کے بعد پھر کوئی آثار اضطراب یا پریشانی کے ظاہر نہ ہوئے---- اور اپنے طریق کار کی تبدیلی کا تو غالباً سوال ہی مولانا کے ذہن میں پیدا نہ ہوا---- !

اٹھتے۔ ایک کے دکھ کو دیکھ کر دوسرے کے دل میں بے چینی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک کی مصیبت میں کسی دوسرے کے دل میں شریک ہونے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی ----- اب ملاقات کے موقع پر سرد مہری چہرے سے ٹپکی پڑتی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے دکھ سکھ سے لاتعلقی طرزِ عمل میں نمایاں نظر آتی ہے ----- اور تعلقات اگر ہیں تو بس اتنے جتنے کسی سیاسی جماعت کے کارکنوں میں ہوا کرتے ہیں۔

اسی پر اکتفا نہیں ہے -----اب جماعت کے اراکین کی آپس کی مقدمہ بازیاں ہی جماعت کے لیے ایک درد سر بن گئی ہیں۔ ارکان جماعت کے جھگڑوں اور قضیوں کا نمٹانا ہی (بقول مولانا امین احسن اصلاحی) امرائِ جماعت کی سب سے بڑی مصروفیت ہے۔ باقاعدہ دھڑے بندیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ آنکھوں سے جو جذبات ٹپکتے ہیں ان میں بلا سے ''محبت'' نہ ہوتی تو بھی معاملہ اس قدر سنگین نہ ہوتا' یہاں تو باقاعدہ ''نفرت'' پائی جاتی ہے۔

''رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ'' کی وہ شان جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے اور فی الواقع قبل از تقسیم ----- اور

تقسیم کے بعد بھی ایک عرصے تک---- جماعت میں پائی جاتی تھی' آج اس کا فقدان بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ بات جماعت میں ہر سوچنے سمجھنے والے کو تشویش میں ڈالے ہوئے ہے۔

جماعت کے کارکنوں کی حالیہ کیفیت کا جو نقشہ اوپر کے صفحات میں کھینچا گیا ہے اس کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب ۱۹۴۷ء میں طریق کار تبدیل کیا گیا' لیکن اس کے نقوش کو اجاگر ہونے میں دیر لگی۔ تاہم ۵۴-۱۹۵۳ء میں یہ نقوش بھی اُجاگر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور اب تو یہ اس قدر نمایاں ہیں کہ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ دے کر ہی ممکن ہے کہ اس بھیانک تصویر کو دیکھنے سے بچا جا سکے !

جب ان نتائج کے آثار ہویدا ہونے شروع ہوئے تو اس بات کی ضرورت تھی کہ صورتِ حال کی اصل نزاکت اور معاملے کی اصل نوعیت کا ادراک کیا جاتا۔ مرض کی اصل

تشخیص کی جاتی اور پھر مناسب اور شافی علاج کیا جاتا ----- لیکن جو کچھ عملاً ہوا وہ یہ کہ ایک طرف تو ان باتوں پر اظہارِ اطمینان کیا گیا کہ ----- ''ابھی ہم اتنے نہیں گرے ! -----اور ابھی ہم دوسری سیاسی جماعتوں سے اخلاق' کردار' جوشِ عمل' ڈسپلن اور خلوص میں بہت آگے ہیں ! (۳۰)'' اور دوسری طرف اصلاحِ حال کی کوئی سعی کی بھی گئی تو وہ کچھ اس وجہ سے کہ مرض کی صحیح اور گہری تشخیص کی بجائے ایک سطحی سے احساس پر مبنی تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ وقت کی مصروفیات نے مہلت نہ دی' کچھ ایسی زیادہ مفید ثابت نہ ہوئی۔ بحث طویل ہو رہی ہے لیکن جو کچھ کوشش بھی کی گئی اس کے غیر موثر ہونے کی وجہ بھی میں چاہتا ہوں کہ بیان کر دوں ----- ''تربیت گاہوں'' کا جو سلسلہ اس ضرورت کے احساس کے تحت شروع کیا گیا تھا اس کے غیر موثر ہونے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ یہ محدود پیمانے پر تھا' لیکن دوسری اور بڑی وجہ در اصل یہ تھی کہ تربیت گاہوں میں جس لٹریچر کے پڑھانے پر پورا وقت اور سارا زور صَرف کیا جاتا تھا وہ اکثر و بیشتر قبل از تقسیم کا لکھا ہوا تھا' جس کے مطالعے سے ایک انقلابی جماعت کا نقشہ نظروں کے سامنے آتا تھا اور اسے ذہنوں میں پختہ کر کے جماعت کے کارکن عملی میدان میں آتے تھے تو وہاں ساری جدّوجُہد ''ایک قومی سیاسی جماعت'' کے طرز پر ہو رہی ہوتی تھی۔ اس سے جہاں اور بھی کئی دلچسپ ردِّ عمل ظاہر ہوئے (مثلاً ----- یہ عام خواہش کہ اب ہمارا لٹریچر پرانا ہو گیا ہے' نئے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے !) وہاں یہ بہر حال ہوا کہ تربیت گاہوں کے تمام اثرات عمل کے میدان میں آتے ہی ختم ہو جاتے رہے اور اس طرح تربیت گاہیں اصلاح حال میں قطعاً کامیاب ثابت نہ ہوئیں۔

_____(۳۰) یاد رہے کہ سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی (۱۹۵۵ء) میں اس مفہوم پر مشتمل چند فقرے مولانا مودودی صاحب کی زبان سے نکلے تھے جنہیں مولانا نے کسی صاحب کے توجّہ دلانے پر واپس لے لیا تھا۔

نقوشِ تازہ

دورِ اوّل کی جماعت کی بحیثیت جماعت جو چار خصوصیات میں نے بیان کی تھیں' ان کے بالکل برعکس جو چار صفات دورِ ثانی کی جماعت میں بحیثیت جماعت پائی جاتی ہیں' وہ یہ ہیں:

عوام پرستی

اس دَور میں ''حق پرستی'' کی بجائے ''مصلحت پرستی'' اور ''عوام پرستی'' جماعت اسلامی کے طرزِ عمل کی نمایاں خصوصیت ہے۔

''نسلی مسلمانوں کے لیے دو راستے'' نامی مضمون میں مولانا مودودی صاحب نے حق پرستی اور اصول پرستی کو تحریک اسلامی کی لازمی صفت اور مصلحت پرستی' موقع شناسی اور عوامی خواہشات کی پیروی کو قومی تحریک کی لازمی خصوصیت کی حیثیت سے بیان کیا تھا۔ یہ اصول اس قدر صحیح اور اٹل ثابت ہوا کہ خود جماعت اسلامی بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچی!

جب تک یہ ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی اس میں حق پرستی اور حق گوئی کی شان بالکل نمایاں رہی۔ ''حق گوئی'' اور اس میں ''بے باکی'' کی عظیم الشان مثالیں اس نے پیش کیں اور اس سلسلے میں اس نے کبھی ''روباہی'' کا ثبوت نہ دیا۔

لیکن جب اس نے ایک قومی جماعت کا روپ دھار لیا تو وہ اصول پرستی اپنی موت آپ مر گئی۔ تا آنکہ اب بے اصولے پن کی عملی مثالیں ہی نہیں (ان کی تو پھر بھی توجیہہ کی جا سکتی ہے) قولاً بھی اس کا اعتراف (اگرچہ ذرا خوشنما الفاظ میں) جماعت کے انتہائی ذمہ دار لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک قومی جماعت کے

لیے ملکی اور قومی مسائل میں قومی میلانات و رجحانات اور قوم کے احساسات و جذبات کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ یہی جماعت اسلامی کو بھی کرنا پڑا۔

اس داستان کا المناک ترین باب ''مسئلہ قادیانیت'' میں جماعت اسلامی کا طرزِ عمل ہے ! اس کے دوران جماعت اور اس کے قائدین نے جس طرح اپنے اصولوں کی بجائے عوام کے چشم و ابرو کے اشاروں پر حرکت کی ہے' اسے دیکھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اتنی قلیل مدت میں ایک جماعت کا مزاج اس درجہ بھی بدل سکتا ہے !

اس مسئلے کے بارے میں چند باتیں بالکل واضح ہیں:

- یہ مسئلہ کوئی آج کی پیداوار نہیں تھا بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر ہی سے اس کے بارے میں مسلمانوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے ----- لیکن اپنے تاسیس کے دن سے لے کر ۱۹۵۲ء تک پورے گیارہ بارہ سال جماعت اسلامی نے بحیثیت جماعت یا اس کے اکابرین نے بحیثیت افراد اس پر کوئی عملی اقدام کرنا تو کجا زبان سے ایک حرف تک نہ نکالا' بلکہ ایک اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے اپنے دورِ اوّل میں اس نے ایسی باتیں کہیں کہ جن سے قادیانیوں کی تکفیر کی براہ راست نہ سہی بالواسطہ ضرور ہمت شکنی ہوتی ہے ! (ملاحظہ ہو تکفیر بغیر اتمامِ حُجّت سے متعلق جماعت کا نقطہ نظر' ص ۵۱)

- پاکستان کے قیام کے بعد کچھ عرصہ خفّت اور ندامت کے باعث خاموش رہ کر جب زعماءِ احرار نے اپنے لیے یہ راہِ عمل تجویز کی کہ ایک طرف سیاسی طور پر مسلم لیگ میں مدغم ہو جایا جائے اور دوسری طرف اپنے تشخص کو اینٹی قادیانی تحریک اٹھا کر باقی رکھا جائے اور اس پروگرام پر انہوں نے عمل درآمد شروع کر دیا تو

جب تک ان کی مساعی ابتدائی دور میں رہیں جماعت اسلامی کے اکابرین نے نجی محفلوں میں قادیانیوں اور ان کے خلاف احرار کی تحریک کے بارے میں کیے گئے سوالات کے مندرجہ ذیل جوابات دیے:

۱) ختم نبوت لازماً جزوِ ایمان ہے اور اس کا منکر کافر----- لیکن تکفیر کا کام کسی فرد یا کسی گروہ کے کرنے کا نہیں بلکہ اسلامی ریاست کا کام ہے۔

۲) ''قادیانیت'' مسلمان قوم میں دین حق سے لگاؤ میں انحطاط آجانے کی وجہ سے پیدا ہونے والی اور دوسری بہت سی گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ دین کی اصل تعلیمات واضح نہیں ہیں۔ اس کا علاج منفی طور پر اس کی

مخالفت اور بیخ کنی سے نہ ہو گا بلکہ اس طرح ہو گا کہ دین کی اصل تعلیمات کو واضح اور عام کیا جائے۔

۳) قادیانیوں کی مخالفت جس طرز پر ہو رہی ہے' وہ ان کو کوئی نقصان پہنچانے کے بجائے ان کی تقویت کا موجب ہو رہی ہے۔ اگر ان کا ابطال کرنا ہی ہے تو چاہیے کہ سنجیدہ' علمی اور سائنٹفک طریقے پر ان پر تنقید کی جائے اور عوام کو ان کے غلط اور گمراہ کن عقائد سے خبردار کیا جائے۔

۴) قادیانیوں کا معاملہ صاف ہو تو بھی لاہوری احمدیوں کا معاملہ اس قدر صاف نہیں ہے' چونکہ وہ مرزا غلام احمد کو صرف ایک مجدد مانتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تکفیر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

مطلب یہ کہ ''قادیانیت'' بذات خود نہ تو سرے سے اس قابل ہے کہ اسے ایک مسئلہ بنایا جائے' اور بنایا جائے تو اس فتنے کے ابطال کا وہ طریق کار جو مجلس احرار نے اختیار کیا ہے' نہ اصولاً صحیح ہے اور نہ نتائج کے اعتبار سے مفید!

- لیکن جب ۱۹۵۲ء میں زعمائے احرار نے اسے واقعی ایک مسئلہ بنا لیا اور عوام کے جذبات کو مشتعل کر لیا تو اب جبکہ اصول پرستی اور مردانگی کا تقاضا یہ تھا کہ یہی باتیں علی الاعلان کہی جاتیں اور لوگوں کو بتایا جاتا کہ تم خوا مخواہ مشتعل کیے جا رہے ہو' نہ یہ مسئلہ اتنی اہمیت رکھتا ہے اور نہ اس کے حل کی صورت وہ ہے کہ جو اختیار کی جا رہی ہے ----- اور اگر عوام اسے رد کرتے تو کم از کم ''اِنِّی بَرِیءٌ'' کہہ کر الگ ہو جایا جاتا ----- جماعت اسلامی نے اپنی اصول پسندی اور اصول پرستی کو ذبح کر کے----- ''حق گوئی'' سے جی کتراتے اور ''روباہی'' کا ثبوت دیتے ہوئے جو طرز عمل اختیار کیا وہ ''بے اصولے پن'' اور ''عوام خوفی'' کی عملی تصویر ہے۔ چنانچہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ ہشت نکاتی مطالبے میں نویں نکتے کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ اور مجلس عمل کے ساتھ تعاون شروع کر دیا گیا اور ان لوگوں کی قیادت قبول کر لی گئی کہ جن کے پاس بیٹھتے ہوئے بھی بقول ''یکے از بزرگانِ جماعت'' جماعت کے زعماء کو ''گھن آتی تھی''۔ اور جن کے حقیقی ارادوں

اور عزائم پر سے بعد میں مولانا مودودی نے ''بیانِ حقیقت'' میں پردے اٹھائے ! (یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مولانا مودودی صاحب احرار کے عزائم سے کراچی کے مجلسِ عمل کے اجلاس سے پہلے بالکل بے خبر تھے اور ان کی نیتوں کے بارے میں پہلے وہ خوش فہمی میں مبتلا تھے... ذہن قبول نہیں کرتا کہ ایسا ہو سکتا ہے... تو پھر ان ''بدنیت'' لوگوں کے ساتھ تعان کس اصول ''اخلاق و دیانت'' کی رو سے صحیح تھا؟)

* صرف یہی نہیں کہ عوام کے ''تقویٰ'' کی وجہ سے جماعت نے اس معاملہ میں حصّہ لینا شروع کر دیا بلکہ ان کی بارگاہ میں ''احسان'' کا درجہ حاصل کرنے کی سعی شروع ہو گئی اور ''قادیانی مسئلہ'' تصنیف ہوا' جس میں ''عوام'' کے مطالبات کی وجوہات اور ان کے دلائل کو مولانا مودودی صاحب نے پُر زور انداز میں پیش کیا۔ اس کتاب کے آخری پیرے میں یہ ''عوام پرستی'' جس طرح چھلکی پڑتی ہے وہ قابلِ دید ہے:

''اس میں شک نہیں کہ اس مطالبے کو منوانے کے لیے عوام جس طریقے سے مظاہرے کر رہے ہیں وہ شائستہ نہیں ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگ کسی طرح اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ مگر اپنی قوم کے عوام کو یہ تربیت دینے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ابھی چند ہی سال پہلے اسی پنجاب میں ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی وزارت کو توڑنے کے لیے مسلم لیگ نے جو ایجی ٹیشن کیا تھا وہ اس تازہ ایجی ٹیشن سے اپنی کون سی خصوصیات

میں کچھ گھٹ کر تھا؟ یہ تو موجودہ قائدین ملّت کا اپنا لگایا ہوا باغ ہے جس کی بہار دیکھ کر وہ آج گھبرا اُٹھے ہیں۔ اب اس مظاہرۂ ناشائستگی کا الزام ''ملّا'' کو دیا جا رہا ہے مگر ہمیں بتایا جائے کہ خضر حیات خاں کے خلاف جس شائستگی کے مظاہرے ہوئے تھے وہ کس ''ملّا'' نے کرائے تھے؟ اینٹی ملّا حضرات کا تو اب یہ منہ نہیں ہے کہ شائستگی و نا شائستگی کا سوال چھیڑیں۔ انہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ مطالبہ معقول ہے یا نہیں اور اس کی پشت پر رائے عامہ کی طاقت ہے یا نہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں ثابت ہیں تو پھر جمہوری نظام میں کسی منطق سے ان کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔''
جذبۂ عوام پرستی کی انتہا ہے کہ ان خامیوں اور خرابیوں کو بھی خوشنما الفاظ کے

پردے میں چھپا کر پیٹھ ٹھونکی جا رہی ہے کہ تم سے کچھ غلطیاں تو ضرور سرزد ہو رہی ہیں لیکن گھبرائو نہیں... اس میں تمہارا قصور تھوڑا ہی ہے!

* اس کے بعد جب ''احرار'' کے ساتھ مزید چلنا نا ممکن ہو گیا اور مجلسِ عمل سے علیحدگی ناگزیر ہو گئی تو بھی اس احتیاط کے ساتھ علیحدگی کا اعلان کیا گیا کہ عوام اسی بھرّے میں رہیں کہ ''... ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے!'' آخر عوام کی ناراضی مول لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔

* پھر جب معاملہ تحقیقاتی عدالت میں آیا تو اس وقت مولانا مودودی صاحب نے حالات کو بگاڑنے کی ذمہ داری میں حکومت اور قادیانیوں کے ساتھ ''احرار'' کو بھی شریک کیا! یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تینوں برابر کے ذمہ دار تھے تو آج سے قبل آپ ساری ذمہ داری حکومت اور قادیانیوں پر کیوں ڈالتے رہے؟ کچھ تو آپ نے احرار کے بارے میں بھی فرمایا ہوتا! ... اور جماعت اسلامی کو مِن حیث الجماعت تو اس ''قولِ ثقیل'' کے کہہ گزرنے کی پھر بھی ہمت نہ ہوئی۔ جماعت نے اپنے بیان میں ساری ذمہ داری صرف حکومت اور قادیانیوں ہی پر ڈالی۔

* تحقیقاتی عدالت میں مولانا اور جماعت نے اپنے آپ کو ان سارے معاملات میں بالکل بریٔ الذمہ ٹھہرانے کی کوشش کی اور اس کے لیے سارا زور اس استدلال پر صرف کیا کہ ہم نے مجلسِ عمل سے علیحدگی اختیار کر لی تھی... لیکن میں اس معاملے میں تحقیقاتی عدالت کے اس فیصلے کو بالکل صحیح سمجھتا ہوں کہ:

''ہم اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے کہ آیا جماعت نے علیحدگی اختیار کر لی تھی یا نہیں۔ دونوں طرف حلفیہ بیان ہیں (۳۱) اور ہمیں ان میں سے کسی کو سچا اور دوسرے کو جھوٹا کہتے دکھ ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ عوام کے سامنے جماعت کی پوزیشن کیا تھی اور یہ بالکل صاف ہے کہ عوام کے سامنے جماعت نے اپنے آپ کو ان کے Cause میں شریک ہی کی حیثیت سے پیش کیا

_____(۳۱) ایک طرف جماعت کا حلفیہ بیان تھا کہ ہم نے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور دوسری طرف مجلسِ احرار کی جانب سے اس کی حلفیہ تردید تھی۔

تھا۔ لہٰذا جماعت اسلامی ذمہ داری میں احرار کے ساتھ برابر کی شریک ہے!'' (تقریباً اسی قسم کے الفاظ تھے' میرے پاس رپورٹ اس وقت موجود نہیں ہے)

* اس کے بعد جب تک مقدّمات چلتے رہے اور عوام کے جذبات میں اس مسئلہ پر حرارت باقی رہی' جماعت کے رسائل و اخبارات اس مسئلہ پر مسلسل لکھتے رہے۔ جب فضا ٹھنڈی ہو گئی' جماعت نے بھی مسئلہ کا نام لینا بند کر دیا اور آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہوا ہی نہیں تھا۔

یہ پوری داستان بے اصولے پن اور عوام پرستی کا شاہکار نہیں تو اور کیا ہے؟

تقدیم و تاخیر میں انقلاب

اس دور میں طریق کار میں تقدیم و تاخیر اور مختلف کاموں میں تدریج و ترتیب بھی عملاً بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

* پہلے علمی اور تعلیمی کام سب پر مقدّم تھا۔

اب وہ سب سے مؤخر ہو گیا ہے -----بلکہ صحیح تر الفاظ میں بالکل ختم ہو کر رہ گیا! خالص علمی کام کے سلسلے میں اس دور میں صف ِاوّل کے اہلِ قلم کو تو کچھ کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں مل سکا' صف دوم کے اہلِ قلم نے کچھ کام کیا ہے لیکن نہ ہونے کے برابر۔ اور اوّل تو اس کا معیار بھی کچھ ایسا بلند نہیں اور ثانیاً ہوتا بھی تو ان کا علمی دُنیا میں مرتبہ و مقام ہی ابھی ایسا نہیں ہے کہ ان کا کوئی کام فوراً نگاہوں کے سامنے آ سکے۔

اس کی وجہ بہر حال یہ تو نہیں ہے کہ علمی کام کافی مقدار میں ہو چکا ہے اور مزید کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ابھی جو کام ہوا ہے اس کی حیثیت جتنا کام مطلوب ہے اس کے مقابلے میں پَر کاہ کی بھی نہیں ہے اور اس کے بغیر کسی پائیدار اور مستحکم انقلاب کے خواب دیکھنا ایک بدیہی غلطی ہے۔ تو ضرورت تو بہر حال تھی اور ہے' لیکن ہو یہ اس لیے نہ سکا کہ ''دوسری مصروفیات'' نے وقت نہ دیا۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جماعت اسلامی کے سب سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہتھیار دو تھے۔ ایک اس کا اخلاقی دبدبہ اور وقار اور دوسرے اس کا وہ علمی مرتبہ اور

رعب جس کا لوہا اس نے ایک قلیل مدت میں منوا لیا تھا۔ ان میں سے پہلے کے کند ہونے کا تذکرہ تو میں کر چکا ہوں۔ یہاں گزارش یہ ہے کہ یہ دوسرا ہتھیار بھی کند ہو چکا ہے۔

اس کے کند ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ ہوا کہ علمی کام جماعت کے حلقے میں بند ہو چکا ہے اور جماعت کا علمی سرمایہ صرف وہ چند کتابیں ہیں جو بالکل اوائل میں لکھی گئی تھیں اور جو اپنی جگہ پر اگرچہ بہت وقیع ہیں اور جس زمانے میں وہ منصۂ شہود پر آئیں تو میدان میں چونکہ یہ اپنی قسم کی واحد کوششیں تھیں لہٰذا انہوں نے ایک مرتبہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں اپنا وزن محسوس کرا لیا تھا لیکن بہر حال ان کی حیثیت پیشِ نظر علمی انقلاب کے صرف دیباچے کی تھی۔ اصل کام تو ان سے شروع ہونا تھا لہٰذا جب انہی پر full stop لگ گیا تو ان کی وقعت کو بہر حال گرنا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان نو سالوں میں کہ جن کے دوران میں جماعت کے حلقے میں علمی بازار بالکل سرد رہا ہے، کچھ اور حلقوں نے آگے بڑھ کر اور جماعت سے بہتر نہیں تو بہر حال اس ہی کی طرح کا کچھ نہ کچھ علمی سرمایہ فراہم کر لیا ہے۔ ایک طرف ''تجدد'' کے علمبرداروں نے اس مہلت سے پورا فائدہ اٹھایا اور پے در پے اس قدر تصانیف میدان میں لا کر ڈال دیں کہ اور کچھ نہیں تو بہر حال یہ تو ہو گیا کہ اب جماعت اسلامی میدان میں تنہا نہیں ہے بلکہ مقابل کی قوتیں آ موجود ہوئی ہیں۔ ادارۂ طلوع اسلام اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور اسی طرح کے کچھ اور اداروں نے کتابوں کے انبار کے انبار لگا دیے ہیں اور جماعت اسلامی کا وہ علمی دبدبہ اور وقار جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اب باقی نہیں رہا ہے جو اس سے قبل تھا۔ دوسری طرف ''قدامت پرست'' حلقے بھی خاموش نہیں بیٹھے رہے۔ انہوں نے بھی جس طرح کی تصانیف بھی ان سے بن پڑیں مرتّب کیں اور میدان میں لے آئے تاکہ ''علم کی پیاس'' کی وجہ سے ان کے اپنے حلقوں کے جو لوگ جماعت اسلامی کی طف متوجّہ ہو رہے تھے ان کو اپنے ہی حلقوں کی کتب سے سیراب کیا جا سکے!

اس طرح جماعت کی یہ زبردست ''قوتِ تسخیر'' بھی زنگ آلود ہو چکی ہے۔

تعلیمی کوششوں کے میدان میں سب سے پہلے راولپنڈی کی درس گاہ والی سکیم ناکام

ہوئی۔ پھر ایک عرصہ تک اس سلسلے میں ضرورت محسوس کی جاتی رہی لیکن ہو کچھ نہ سکا۔ قرارداد مقاصد کے بعد اطمینان کا جو سانس لینا نصیب ہوا تھا اس میں چند مدارس کی ابتدا کی گئی لیکن اس میں بھی کسی نئی تعلیمی پالیسی کا اجراء نہ ہوا بلکہ بس ''ضرورت کے احساس'' کو مطمئن کر لیا گیا۔ اب ایک عربی مدرسے کی ابتدا حیدر آباد سندھ کے پاس ہوئی ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ تعلیمی انقلاب ہے جس کا نعرہ اس قدر زور سے بلند کیا گیا تھا۔

* دعوت، تنظیم اور اصلاح و تربیت کا کام بھی نہ صرف یہ کہ سیاسی مصروفیتوں کے باعث بالکل نہ ہو سکا، بلکہ اس سلسلے میں جماعت کے نظریات میں بھی بڑا انقلاب واقع ہوا۔

دعوت کے سلسلے میں جماعت کا سارا زور ''خود کو بدلو'' کے بجائے ''حکومت سے مطالبہ کرو'' پر رہا۔

پورے ۹ سال تک دعوت کا کام حقیقتاً بند رہا اور اس سے جو زبردست نقصان تحریک کو ہوا اس کے ایک پہلو پر تو سب کی نگاہ ہے کہ ''ہمارا کام نہ ہوا'' لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں کی نگاہ ہے کہ ''دوسرے کام کر گئے'' ۔ اس پورے عرصے میں جب کہ جماعت دستور اسلامی کی مہم چلاتی رہی' ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے میں ''تجدد پسندوں'' کے افکار اور خیالات تیزی کے ساتھ پھیلے ... اور دوسری طرف پرانے دینی طبقوں کو جن سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوگ جماعت میں شامل ہو رہے تھے' اپنے تحفظ کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے اپنے حلقوں کے گرد ایسا حصار کھینچ لیا کہ اب اگر جماعت کوشش کرے تب بھی اپنے افکار و خیالات کو آسانی کے ساتھ اس حلقے میں نہیں پھیلا سکتی ! چنانچہ آج جماعت دونوں اطراف سے 'اچھوت'' بنا کر رکھ دی گئی ہے۔ قدامت پسند گروہ میں وہ تجدد پسند مشہور ہے اور تجدد پسند گروہ اسے قدامت پسندی کے طعنوں سے نوازتا ہے... اور جماعت ہے کہ دونوں کے درمیان بالکل isolate ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی بات نہ وہ سنتے ہیں کہ جن پر جدید رنگ غالب ہے اور نہ وہ سنتے ہیں کہ جن پر قدیم رنگ پختہ ہے۔ ایک بہت ہی پتلی سی تنگنائے ہے جو ''کچھ ادھر کے اور کچھ اُدھر کے'' اور زیادہ صحیح الفاظ میں ''نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے'' لوگوں پر مشتمل ہے کہ جن میں جماعت کے افکار و

نظریات کے بآسانی پھیلنے کے مواقع باقی رہ گئے ہیں۔ اس بات کا اصل اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ جماعت پھر اپنی دعوت لے کر میدان میں نکلے اور دونوں طبقات سے مخاطب ہو۔ اس وقت اندازہ ہو گا کہ یہ مورچے اب مضبوط دفاعی انتظامات کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔

اصلاح و تربیت کا بھی عملی کام تو کوئی نہ ہو سکا' البتہ ایک دو بار جو کوششیں ہوئی ان کا یہ پہلو لائق توجّہ ہے کہ ان میں جماعت نے اپنے اس مخصوص طریق کار کو چھوڑ کر جو اس نے دورِ اوّل میں اختیار کیا تھا' ان سطحی طریقوں کو آزمایا ----- یا آزمانے کی کوشش کی جن سے کسی حقیقی اور مستحکم اصلاح کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہو گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہاں کے معاشرے کے بارے میں جماعت اسلامی کی رائے اب یہ ہو گئی تھی کہ اس کی اصلاح کے لیے ''انجمن تحفظ اخلاق عامہ'' کی قسم کی کوششیں کار آمد ثابت ہو سکیں گی اور ''اصلاح معاشرہ'' کی مہم سے یہ توقعات وابستہ کی گئیں کہ ان سے معاشرہ میں اخلاقی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

پھر تعجب پر مزید تعجب اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ خیال اناڑیوں کا نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کی طرف سے پیش ہوا کہ جو اس سے قبل (دورِ اوّل میں) معاشرے کا صحیح تجزیہ کرکے صحیح نہج کار اختیار کر چکے تھے۔

* اس دورِ ثانی میں سیاسی مصروفیات کے علاوہ اگر کسی کام پر فی الواقع توجہات اور سعی وجُہد مرکوز ہوئی ہیں تو وہ خدمت خلق کا کام ہے۔ اس کام کے لیے وقت اور ذرائع اس لیے نکل آئے کہ وہ در اصل سیاسی کام ہی کا ایک ضمیمہ تھا اور اس سے اصل مقصود سیاسی اغراض تھیںاور یہ بات کہ دستوری جدّوجُہد کے زمانے میں جب کہ علمی اور

تعلیمی کام یک قلم موقوف ہو گئے اور دعوت و تربیت کے لیے وقت قطعاً نہ مل سکا' اس کام کے لیے وافر وقت اور وافر قوت نکالی گئی' اس بات کا بیّن اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اس سے اصل مقصود رضائے الٰہی کا حصول اور اس کا اصل محرک خدمت خلق کا جذبہ نہیں بلکہ مقصود اصلی ارزاں شہرت اور محرکِ اصلی اس کی طلب تھی!

یہی وجہ ہے کہ شعبۂ خدمت خلق کے کام میں اصل توجّہ کام کے معیار پر صرف نہ کی گئی بلکہ اس کی مقدار کو بڑھانے کی دُھن سوار رہی۔ جہاں دو چار کرسیاں اور میزیں اور ایک طبیب نما ڈاکٹر یا ڈاکٹر نما طبیب مل گیا' شفاخانہ کھول دیا گیا۔ مجھے حقیقتاً جماعت کے اکثر شفاخانوں کو دیکھ کر صدمہ ہوا ہے کہ جس کام کا شہرہ اتنا اور غلغلہ اس قدر ہے' اس کی حقیقت یہ ہے! آپ نے ایلوپیتھی اور طب کی ملی جلی ڈسپنسریاں قائم کر کے ان لوگوں کو ان میں لوگوں کی موت و زندگی سے کھیلنے کے لیے لا بٹھایا کہ جو نہ طبیب تھے نہ ڈاکٹر! صرف اس لیے کہ پبلک کے سامنے یہ کارنامہ تو لایا جا سکے کہ ہم نے ایک ''شفاخانہ'' قائم کر دیا ہے۔ ع ''ہم نے کیا کیا نہ کیا دیدہ و دِل کی خاطر!''

اس ''شعبۂ خدمت خلق'' نے جہاں اور بہت سے نقصانات جماعت اور اس کے کام کو پہنچائے ہیں وہاں اسی کی وجہ سے ایک بہت بڑی پیچیدگی علماء کے اس طبقے کا جماعت سے خبردار اور ہوشیار ہو جانا تھا جن سے زکوٰۃ و صدقات اور چرمہائے قربانی و عقیقہ چھین کر جماعت نے ان کے معاشی وسائل میں دست اندازی کی تھی۔ یہاں سوال صرف علماء کے ایک طبقے کی معاش ہی کا نہیں اس پورے قدیم نظام تعلیم کا بھی تھا جس کے فنانس کا سب سے بڑا ذریعہ زکوٰۃ و صدقات ہی کی رقوم تھیں۔

چنانچہ ''تملیک زکوٰۃ'' کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی سب سے بڑی اہلِ علم اور اہلِ قلم ہستی نے ''علمی بزدلی'' کا بیّن ثبوت فراہم کیا۔ اوّل اوّل جب یہ مسئلہ چھڑا تو جواب دینے کے لیے میدان میں مولانا مودودی صاحب تشریف لائے اور ایچ پیچ کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی۔ آپ نے ایک طرف ''لامِ تملیک'' کو اصولاً تسلیم کر لیا (اس لیے کہ یہ اس ملک کی واضح اکثریت کی فقہ کا متفقہ اصول تھا) لیکن ایک لمبے اور پیچیدہ استدلال سے اس کی ایسی توجیہہ کی کہ جس سے اس کی عملی قید و پابندی ختم ہو جائے۔ علماء کرام میں سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ایک مدلل جواب دیا اور مولانا کے استدلال کی کمزوری کو واضح کر دیا۔ اب صحیح طریقہ یہ تھا کہ مولانا خود ہی سامنے آتے اور یا تو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے یا پھر لامِ تملیک کا انکار کر کے نیا

استدلال قائم کرتے۔ لیکن اس موقع پر انہوں نے مولانا اصلاحی صاحب کو جواب کے لیے آگے لا کھڑا کیا اور انہوں نے لامِ تملیک ہی سے انکار کر کے اس مخمصے کو ختم کیا جس میں مولانا مودودی صاحب پھنس گئے تھے!

لیکن اس طرح یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ بس جماعت اسلامی کے متعلقین کے لیے حل ہوا تھا' اس سے عوام کی تسکین اور اطمینان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کراچی کو چھوڑ کر باقی تمام جگہوں پر محسوس کیا گیا کہ اب یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکے گا' تو پھر اب یہ خیال پھیل رہا ہے اور اسی کی طرف جماعت کی مرکزی پالیسی جا رہی ہے کہ شفاخانوں کو کم کیا جائے یا کم از کم اور نہ کھولے جائیں۔ جو ہیں' ان کو ''مفت'' سے آہستہ آہستہ ''سستا'' بنا دیا جائے اور زکوٰۃ و صدقات کی رقوم سے عربی مدارس کھولے جائیں۔ ع ''لیک بعد از خرابی بُسیار!''

حلقۂ متّفقین

اس دورِ ثانی میں ایک اور نمایاں بات کہ جو دورِ اوّل سے بالکل متضاد نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اب جماعت کا سارا زور رکنیت سازی سے ہٹ کر ''متّفقین سازی'' پر ہو گیا ہے۔ یہ بھی دوسری تمام چیزوں کی طرح اس طریق کار کا ایک فطری تقاضا تھا کہ جو ۱۹۴۷ء میں اختیار کیا گیا۔

اس سے قبل رکنیت جماعت پر جو زور دیا جاتا تھا اور ہمدردوں سے جس طرح تخاطب کیا جاتا تھا وہ اسی تحریر کے صفحہ ۹۲۔۹۳ پر ایک مرتبہ پھر نظر دوڑا کر ذہن میں مستحضر کر لیجیے۔ اور اب دورِ ثانی میں جو طریق اختیار کیا گیا اس کو دیکھئے تو کم از کم زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ وہی مولانا امین احسن اصلاحی جن کی تقریر کا اقتباس وہاں درج کیا گیا ہے' ۱۹۵۵ء کی ابتدا میں منٹگمری کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''جماعت اسلامی کی رکنیت کا معاملہ بڑے کھکھیڑ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ اس کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کر سکیں تو حلقہ متّفقین میں شامل ہو جائیے۔'' (روایت بالمعنی)

گویا کہ اب جماعت کی رکنیت لازمی نہیں رہی... اس کے لیے کھکھیڑ مول لینا یا نہ لینا آدمی کی مرضی پر منحصر ہے!

جماعت کی شوریٰ نے جو فیصلہ ملازمین سرکار کے بارے میں کیا' اس میں بھی دانستہ یا نادانستہ اس قسم کے الفاظ آ گئے تھے:

''جماعت ان لوگوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی!''

اور یہ تو قول کا معاملہ ہے' عمل کی بات اس سے کہیں آگے ہے۔ لوگوں کو باقاعدہ مشورے دیے جاتے ہیں کہ رکنیت مت اختیار کرو بلکہ فلاں جگہ جا کر ''ویسے'' ہی کام کرو! اگر رکن بن جاؤ گے تو ''وہاں'' کام کیسے ہو گا!

مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ باتیں صرف تقابل کے لیے عرض کر رہا ہوں' ورنہ مجھے ان میں سے کوئی بات

بھی خلاف توقع نظر نہیں آتی۔ ۱۹۴۷ء میں جو بیج بوئے گئے تھے' یہ انہی کی فصل ہے !

نظامِ بیت المال

نظام مالیات بھی از سرتا پا تبدیل ہو چکا ہے !

دورِ ثانی کی ابتدا ہی میں جب اخراجات تیزی کے ساتھ بڑھنے شروع ہوئے تو چونکہ ارکان کی تعداد بھی بہت محدود تھی اور ان میں سے کم ہی معاشی طور پر خوشحال تھے' اس لیے روپے کی فراہمی کے لیے متّفقین اور متاثرین کی طرف باقاعدہ رجوع کیا گیا اور جوں جوں ''مہماتی کام'' بڑھتا گیا اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے گئے ''فراہمی زر'' بھی باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ ابتداءً تو متّفقین اور متاثرین تک صرف رجوع تھا' فراہمی زر کے طریق کار میں کوئی تبدیلی نہ تھی لیکن یہ طریق کار آخر کب تک ساتھ چل سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ طریق بھی بدل دیا گیا۔ باقاعدہ اپیلیں کر کے چندے جمع کیے گئے۔ مہموں کی شکل میں پیسے فراہم کیے گئے۔ لوگوں کے مکانوں اور دکانوں پر حاضر ہو ہو کر ''اعانت'' طلب کی گئی اور رفتہ رفتہ وہ سارا وقار خاک میں ملا دیا گیا جو دورِ اوّل میں جماعت کے

_____(۳۲) بلکہ صحیح تر الفاظ میں ''سرپرستوں''

مخصوص طریق کار سے پیدا ہوا تھا۔

اور اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ ایک باقاعدہ طبقہ ایسے ''ہمدردوں''(۳۲) کا بن چکا ہے کہ جن سے جماعت کی اپیل ہے ہی صرف یہ کہ ''پیسے دو !'' --------نہ یہ دعوت ہے کہ خود کو بدلو' نہ یہ ترغیب ہے کہ جماعت کے رکن بنو----- دعوت ہے تو ایک اور ترغیب ہے تو بس یہ کہ پیسے دیے جائو ! اسے دانستہ نہ سہی نادانستہ کہہ لیجیے' بہر حال ایسا ایک طبقہ پیدا کیا گیا ہے اور اسے برقرار رکھا جا رہا ہے----- اس لیے کہ اس کے بغیر مالی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں !

دوسری طرف اراکین کے اپنے مالی ایثار میں بے حد کمی واقع ہو چکی ہے ! اور تیسری طرف خرچ میں اب وہ احتیاط اور بیت المال کے بارے میں اب وہ احساسِ ذمہ داری بھی باقی نہیں رہا کہ جو دورِ اوّل میں تھا (اس کی صرف یہ دلیل کافی ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے اس پر اپنی دوسری اسیری سے رہائی کے بعد ایک باقاعدہ سرکلر جاری کیا !)

نتیجۂ کلام

جماعت کے دورِ ثانی کے بنیادی نظریات' اس کے طریق کار' جدّوجُہد کے مراحل اور اس کے نتائج و ماحصل -----اور اس کی خامیوں اور خرابیوں کا یہ جائزہ قدرے طویل ہو گیا ہے' لیکن میں چاہتا تھا کہ پوری تفصیل کے ساتھ بتا دوں کہ اس دَور کے آغاز میں طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی تھی اس نے کس طرح اس کے ایک ایک گوشے کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی کیفیت سابق سے بالکل مختلف بلکہ اس کے بالکل برعکس ہو گئی۔

اس جائزے کے دوران جن آراء کا میں نے اظہار کیا ہے اور جس نقطۂ نظر کو میں نے بیان کیا ہے' میں سمجھتا ہوںکہ کہیں کہیں جزءً تو اس سے اختلاف ممکن ہے لیکن مجموعی طور پر اس سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ جماعت کی قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم کی پوری داستان اس طرح سامنے رکھ دی گئی ہے کہ اس کے ان دو ادوار کے نقوش بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔ دورِ اوّل کے نقوش صفحہ قرطاس پر ثبت کرنے کے بعد میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ایک اسلامی تحریک کے نقش و نگار ہیں -----لیکن اس دورِ ثانی کے نقوش کا سرسری سا مطالعہ بھی یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اس میں ''ایک اصولی اسلامی جماعت'' کی خصوصیات کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتیں۔ یہ ایک خالص بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں' جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی قوم میں برسرِ اقتدار آنے کے لیے اسلام کو بطور نعرہ (slogan) استعمال کر رہی ہے۔

میں نے نہ یہ کہا ہے اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں جب طریق کار تبدیل کیا گیا تو دانستہ طور پر ان لازمی نتائج کو جاننے کے باوجود اور اس تبدیلی کا ادراک کرنے کے باوجود کیا گیا کہ جو اس طرح اس پوری تحریک کی بنیادی نوعیت میں برپا ہو رہی تھی لیکن یہ بہر حال مَیں سمجھتا ہوں اور اسی کو وضاحت کے ساتھ مَیں نے اس قدر طویل تحریر

میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق واقع ہو چکا ہے ! یہاں تک کہ جماعت کی پندرہ سالہ زندگی کے یہ دو ادوار کسی ایک ہی تحریک کے دو مراحل قرار نہیں دیے جا سکتے بلکہ ان میں ہر مرحلہ بجائے خود ایک مستقل تحریک ہے اور یہ دونوں تحریکیں آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں اور ان میں سوائے ایک نام کے اشتراک کے اور کوئی قدرِ مشترک باقی نہیں رہی ہے۔

میری رائے میں جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۱۹۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کی قومی جدّوجُہد کے ساتھ ساتھ اس ابتدائی تحریک کے کچھ اثرات ایک عرصے تک برسر کار رہے ہیں، لیکن اب وہ بھی دم توڑ چکے ہیں۔ اب اس تحریک میں سے اگر کچھ باقی ہے وہ ان چند نیک دل اور مخلص لوگوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جنہیں اس اصل تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطہ میں تھامے چلے آرہے ہیں۔ اور اب بھی اگرچہ ان کی اکثریت کچھ کھٹک محسوس کر رہی ہے لیکن سوائے چند کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے ! مجھے اب مستقبل کے بارے میں بھی کوئی امید ہے تو وہ صرف ان کے خلوص سے ہے کہ اگر آج بھی ان پر واضح ہو جائے کہ فلاں جگہ سے ہم غلط موڑ مڑ آئے ہیں اور اب غلط راستے پر چل رہے ہیں تو وہ آگے بڑھنے کی دُھن میں غلط راستے ہی پر چلتے رہنے کو گوارا کرنے کی بجائے واپس مڑ کر صحیح راستے کو اختیار کرنے میں پس وپیش سے کام نہ لیں گے چاہے اس طرح انہیں ایک طویل مسافت کو دوبارہ قطع کر کے سفر کو تقریباً از سرِ نو ہی شروع کرنا پڑے۔

اور اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس طرح کہ پچھلی غلطیوں کا بے لاگ جائزہ لیا

جائے۔ ایک ایک غلطی کا واضح اور شعوری اعتراف ہو اور اس کے جو جو اثرات جہاں جہاں مترتب ہوئے ہیں ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور کرید کرید کر سامنے لایا جائے ----- اور اسی کی ایک حقیر سی کوشش میں نے اس طویل بیان میں کی ہے -------- اور اگر یہ کوشش اس اصل تحریک تجدید و احیائے دین کے احیاء میں کچھ بھی مفید ثابت ہو سکے جو جماعت اسلامی کے زیرِ سرکردگی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان میں جاری رہی تھی تو میں سمجھوں گا کہ یہی میری نجات کے لیے کافی ہے --------رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ - وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

* * *

تبدیلی کیوں؟

- مبینہ وجوہات کا جائزہ
- اصل سبب

مبینہ وجوہات کا جائزہ

''جماعت اسلامی: اس کی تاریخ، مقصد اور لائحہ عمل'' میں مولانا مودودی صاحب نے ان دلائل کو جمع کر دیا ہے کہ جن کی بنا پر ان کی رائے میں قیام پاکستان کے وقت جماعت کے طریق کار میں تبدیلی (۳۳) ناگزیر ہو گئی تھی۔ اس پوری بحث اور اس میں اختیار کردہ استدلال کا خلاصہ حسب ذیل تین نکات ہیں:

۱۔ مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی اخلاق انتہائی دگرگوں حالت میں تھا۔ ان میں ''صبر، ضبط، نظم، باقاعدگی، محنت، تعاون، مواساۃ، امانت، فرض شناسی، احساس ذمہ داری، حدود کی نگہداشت اور وحدت و اخوت''

کے وہ اوصاف موجود نہ تھے ''جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں''۔ اوّل تو پہلے ہی مسلمان قوم اس اعتبار سے دیوالیہ تھی اور پھر یہ کریلا اس طرح نیم چڑھا کہ: ''دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ' ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے...'' یہ پوری صورت حال ان حالات میں پوری طرح اُجاگر اور نمایاں ہو گئی کہ جو تقسیم کے وقت اور اس کے معاً بعد پیش آئے۔

_____(۳۳) یہاں یہ پیش نظر رہے کہ ان کی رائے میں اس تبدیلی کی نوعیت بس یہ تھی کہ:

''جماعت اسلامی پاکستان کو یک لخت توسیع اور عملی اقدام کے مرحلے میں داخل ہو جانا پڑا!'' جبکہ میرے نزدیک طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کی تحریک کی نوعیت ہی کو بدل کر رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس تبدیلی کو اس قدر ''بنیادی'' نہ سمجھا گیا ہو بلکہ اسی قدر سمجھا گیا ہو جتنی ایک تحریک کے دو مراحل کے طریق کار میں ہوتی ہے لیکن اس نوعیت کی تبدیلی کا ثبوت خود اس تحریر میں موجود ہے: ''... اس لیے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اس وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیر بھی آج تک ہم کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنا ہو گی... اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یک لخت با اختیار ہو گئی ہے۔'' گویا اس طریق کار سے مقصود اقامت دین نہیں بلکہ مسلمان قوم کو سنبھالنا تھا۔

لہٰذا

ناگزیر تھا کہ اس مسلمان قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کی جاتی۔

۲۔ ''۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں ایک مصنوعی انقلاب تھا'' اور ''پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے' ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی' اسے دیکھ کر

صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں ------- اور ''یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجود حالت کی بہ نسبت ہزار گنا زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے!''

۳۔ ''خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے ...''

یہ تمام باتیں جو اس استدلال میں بیان ہوئی ہیں ------- سوائے ایک کے جو بظاہر کسی قدر وقیع معلوم ہوتی ہے --- ---- بقیہ تمام کی تمام اس قدر بودی ہیں کہ ان پر کلام کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

* پہلی بات کے سلسلے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ قوم جس حالت میں تھی آپ نے اس کا ٹھیک ہی اندازہ کیا لیکن یہ آپ کے دل میں یکایک قوم کا درد کہاں سے پیدا ہو گیا تھا؟ آپ تو ایک اصولی اسلامی جماعت تھے۔ ایک عمر آپ کو مسلم قوم پرستی کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی تھی اور مسلمانوں کی گزشتہ قومی جنگ میں کہیں آپ نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا ...

اور آج آپ اس قوم کے درد مند اور بہی خواہ اور ''اس کو سنبھالنے'' کے لیے بے چین نظر آرہے تھے۔ آپ طریق کار میں تبدیلی کا سبب اس بات کو بتا رہے ہیں' حالانکہ دریافت طلب معاملہ یہ ہے کہ خود آپ کے نقطۂ نظر میں یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا؟

* تیسری بات اپنی جگہ خوشنما تو بہت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس سے ثابت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ مان لیا کہ آپ کے ارکان کی اخلاقی اور دینی حالت کی ایک آزمائش ہو گئی تھی لیکن نتیجتاً صرف یہی تو ظاہر ہوا کہ اب تک جو کچھ کام آپ نے کیا وہ صحیح نہج پر تھا اور بار آور ہوا ہے۔ آگے اطمینان سے پیش قدمی جاری رکھیے۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ آپ اپنے کام کی نوعیت ہی بدل ڈالیں۔ اگر آپ اسے تبدیلیٔ نوعیت نہ سمجھیں (اگرچہ فی الواقع ہے ایسا ہی) تو بھی اس امتحان کے نتیجے کو دیکھ کر آپ نے جس قدر بڑا اقدام کر دیا اس کی نوعیت' خود آپ کے نقطۂ نظر کو قبول کر لیا جائے تب بھی' کم از کم ایسی تھی کہ جیسے ایک بچے کا پرائمری کا امتحان لیا جائے اور وہ اس میں ''کامیاب'' ہو جائے تو پھر اسے فوراً کالج میں لا بٹھایا جائے------ اور استدلال یہ کیا جائے کہ جناب یہ امتحان میں کامیاب ہو گیا تھا!

دوسری بات بظاہر کافی وقیع اور وزنی ہے اور جماعت کے اندرونی حلقوں میںاصل میں یہی ایک بات مسلسل بیان ہوتی ہے۔ اس کا جائزہ ذرا تفصیل سے لینے کی ضرورت ہے' لیکن اس سے قبل اس تحریر پر بھی نظر ڈال لیجیے جو اسی معاملے کی توضیح کے لیے ''اسلامی نظام کے قیام کی صحیح ترتیب'' کے عنوان سے ''ترجمان القرآن'' ستمبر۱۹۴۸ء کے رسائل و مسائل میں شائع ہوئی تھی:

''واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے ! (۳۴)

کے بعد مولانا پہلے طریقے کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے

---

(۳۴)اس پر اس اعتبار سے تعریض میں اس سے قبل کر چکا ہوں کہ ------- کچھ ہی عرصہ قبل اسلامی حکومت کا قیام صرف ایک طریقہ پر ممکن ہوا کرتا تھا۔

میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے پر ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہیں (جنہیں ہم نے اپنے ''مطالبہ'' میں بیان کر دیا ہے)۔ پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے۔ پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔''

یہاں آپ ''اسلامی دستور'' اور ''انقلابِ قیادت'' کے لیے لازمی prerequisites کے طور پر اس چیز کو بیان کرتے ہیں کہ برسرِ اقتدار گروہ کے لوگ اتنے مخلص ہوں کہ خود محسوس کر لیں کہ اب ہمارا کام ختم ہوا اور آئندہ کے کام کے لیے ہم ناکارہ ہیں اور از خود پیچھے ہٹ کر کار آمد اور با صلاحیت لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دیں۔

اور پھر جب آپ فرماتے ہیں:

''ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں...''

تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا واقعی اس برسرِ اقتدار گروہ کے بارے میں کہ جس کی شان میں ایک مسلسل قصیدہ پچھلے چار ماہ سے آپ ''اشارات'' میں لکھتے چلے آ رہے تھے اور جس پر بعد میں مسلسل شدید تنقید ہمارے حلقوں سے ہوتی رہی، آپ کی رائے واقعتاً یہی تھی ------- اور نہیں تھی اور ہرگز نہیں تھی ------- تو خود ہی سوچیے کہ اس طرح کی تحریروں سے آپ جماعت کے کارکنوں کو تو مطمئن کر کے ساتھ لے کر چل سکتے تھے اور اس میں بھی شبہ نہیں

کہ پبلک کے ایک طبقہ کو بھی اس طرح مطمئن کیا جا سکتا تھا، لیکن کیا واقعی اپنے اصل کام میں بھی اس سے کسی طرح کا فائدہ اور امداد حاصل ہونے کی توقع تھی؟

اب اس بات کی طرف متوجّہ ہوئیے کہ جسے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ یہ دلیل جو کئی دلائل کا مجموعہ ہے، جماعت کے حلقوں میں بے حد عام ہے۔ اس کا ایک حصّہ تو وہ ہے کہ جو عوام کے سامنے بھی آجاتا ہے اور اصل حصّہ وہ ہے کہ جو خواص میں تو ہے لیکن عوام میں نہیں آتا۔ مجھے اس پورے طرز استدلال کو ایک موقع پر ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز کی زبان سے سننے کا موقع ایک نجی صحبت میں ملا تھا۔ بنا بریں میں ان دونوں حصوں سے کسی قدر واقفیت رکھتا ہوں۔ اس دلیل کے اصل میں دو جزو ہیں: یعنی یہ کہ اگر اس وقت یہاں ایک غیر اسلامی دستور کو نافذ ہونے دیا گیا تو ------- ایک تو پھر اس دستور کو بدل کر اسلامی دستور کا نافذ کرانا لکھوکھا درجے مشکل بلکہ نا ممکن ہو جائے گا۔ اس کے لیے خون کی ہولی کھیلنی ہو گی اور ایک طویل جدّوجُہد کے بعد بھی اس کے بدلے جانے کا امکان بے حد کم ہے! اور..... دوسرے اس طرح ہمارے لیے کام کرنا نا ممکن ہو جائے گا۔ ایک غیر اسلامی دستور کو منظور کرنا تو بہر حال ہمارے لیے ممکن نہ ہو گا، لیکن جب ہم اسے تسلیم نہ کریں گے تو ہماری پوزیشن مملکت کے باغیوں کی سی ہو جائے گی اور ہمارا اصل مقام پھانسی کے تختے اور جیلوں کی کال کوٹھڑیاں ہوں گی ------- اور یہ کام کسی طرح آگے نہ چل سکے گا۔

اس میں سے جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، یہ تو صحیح ہے کہ واقعتا کسی دستور کے ابتدا ہی میں ایک نوعیت کے بنوا لینے اور اس کے کسی اور نوعیت کے بن جانے کے بعد اس کے بدلوانے کی کوشش کرنے میں خاصا فرق ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ دو باتیں اس وقت کس طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ ایک یہ کہ دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب بھی انقلابی تحریکیں برسرکار آئی ہیں اور انہوں نے اپنا خون اور پسینہ بہا کر وقت کے نظام کو بدلنے کی سعی کی ہے، تو آج تک کبھی دستور کے کاغذی پرزے تو دُور رہے، بڑے بڑے جابر اور قاہر شہنشاہوں کا جبر وقہر ------- اور بڑی بڑی مضبوط حکومتوں کی طاقت حتیٰ کہ ٹڈی دل فوجوں کی قوت بھی ان کا راستہ روک نہیں سکی ہے۔ انقلابی تحریکوں کے راستے

میں حکومتیں اور ان کا جبر و تشدد رکاوٹ نہیں بن سکتے تو دستور کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انقلابی طاقتوں کے خلوص کو مصائب و مشکلات اور ابتلا و آزمائش کی کسوٹی پر پرکھا ضرور جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طویل اور جان گداز مگر صحیح اور فطری طریق کار کو چھوڑ کر آسان اور مختصر مگر غلط اور غیر مفید طریق کار کے اختیار کرنے سے یہ توقع قائم کرنا تو بہر حال صحیح نہیں ہے کہ وہ کام ہو جائے گا کہ جو پیش نظر ہے ! جتنی آسانیاں آپ تلاش کریں گے اسی قدر اپنے مقصد سے دور ہوں گے اور اگر کہیں تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی بھی تو وہ سطحی، ناپائیدار اور غیر مستحکم بلکہ متزلزل ہو گی۔ ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آرزو بھی
یہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی !

پھر دوسری بات (اور اس سلسلے میں خصوصاً ملک صاحب کے پُر زور استدلال) کو سن کر تو یہ خیال دل میں پیدا ہونے لگا تھا کہ آج سے سولہ سترہ سال قبل جب اس تحریک کی بنا رکھی جا رہی تھی اس وقت کے پیش کردہ خیالات واقعی ذہن میں غور و فکر کے بعد تیار ہوئے تھے یا بعض کانوں سے سنی ہوئی باتیں تھیں کہ جو زبان و قلم کی جنبش و حرکت کے ذریعے ظاہر ہو رہی تھیں ... اور اس وقت کے ظاہر کیے ہوئے جذبات واقعتا دل میں گہری جڑیں رکھتے بھی تھے یا نہیں؟ ذرا صفحات ۷۸ - ۷۹ پر تحریر ہذا پر مندرج ''ایک صالح جماعت کی ضرورت'' کا اقتباس پڑھیے اور پھر ص ۸۶ پر مندرج اقتباسات پر نگاہ ڈالیے تو اس زمانے میں اس سلسلے میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کا ایک دھندلا سا تصور سامنے آتا ہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا نا ممکن ہے کہ اب جو خطرات سامنے تھے ان کا اندازہ پہلے موجود نہیں تھا اور یہ ایک بلائے ناگہانی کے طور پر نازل ہو گئے تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ پیش آنے والا تھا اسے پہلے ہی پوری باریک بینی کے ساتھ دیکھ لیا گیا تھا اور جب یہ سب کچھ دیکھ کر اس کام کی ابتدا کی گئی اور ان تمام باتوں کے اندازے اور جو کچھ پیش آنے والا تھا اس کے صحیح تخمینے کے بعد اس تحریک کا آغاز کیا گیا تو ظاہر بات ہے کہ اسے کسی طرح صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اب جب کہ ان باتوں کے پیش آنے کا وقت

آیا تو اپنا رخ ہی تبدیل کر دیا گیا۔ (۳۵) میں تو اس معاملہ کو بالکل اس طرح سمجھتا ہوں کہ مشکلات، تکالیف، وقت کے نظام اور اس کی صاحب اقتدار جماعت کے ساتھ تصادم اور مصائب و آلام ہر تحریک کی راہ کے بالعموم اور تحریک اسلامی کی راہ کے بالخصوص نشاناتِ راہ اور سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو اس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم ٹھیک راہ پر چل رہے ہیں۔ یہاں جو کچھ پیش آنا چاہیے تھا وہی آ رہا ہے۔ جو نشانات ملنے

چاہئیں تھے وہ مل رہے تھے اور بحمد اللہ ہم صحیح راہ کو کہیں گم نہیں کر آئے ہیں اور پورے انشراحِ صدر کے ساتھ اس راہ پر سفر جاری رکھا جاتا نہ یہ کہ انہیں سامنے دیکھ کر سفر کا رُخ ہی تبدیل کر دیا جاتا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک جگہ اس راہ کی مشکلات و مصائب کو ''اعوان و انصار'' کا درجہ دیا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کسی راہ کے اعوان و انصار سے خوف کھا کر اس راہ ہی کو تبدیل کر دیا جائے۔

_____(۳۵) یہاں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک غیر اسلامی دستور کے نافذ ہو جانے کی شکل میں فوراً پیش آنے والی مشکلات و مصائب کا تذکرہ جس انداز سے کیا جاتا ہے وہ بھی حقیقی نہیں بلکہ مبالغے پر مبنی ہے !

ایک غیر اسلامی دستور کے نفاذ کی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کون سا پہاڑ تھا جو فوراً ٹوٹ پڑنے کو تیار کھڑا تھا۔ اس صورت میں ہماری پوزیشن انگریزی دورِ حکومت میں متحدہ جماعت اسلامی اور ہندوستان میں آج کی جماعت اسلامی کی پوزیشن سے آخر کس درجہ میں مختلف ہوتی؟ آپ اس غیر اسلامی دستور کو اسی طرح قبول کرتے جس طرح انگریزی حکومت آپ کو تسلیم تھی اور ہندوستان کا سیکولر دستور جماعت اسلامی ہند نے قبول کیا ہے اور پھر اپنے اصل کام یعنی عوام میں دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تنظیم کے ذریعے انقلاب برپا کرتے تاکہ صحیح نہج پر کام آگے بڑھ سکتا۔

تصادم تو اس صورت میں بھی رونما ہوتا لیکن ذرا دیر کے بعد جبکہ آپ عوام میں کافی نفوذ کر چکے ہوتے۔ اس سے قبل تو عین ممکن تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت آپ کے ساتھ ابتداءً تعاون بھی کر لیتی (اور اس کی مثالیں ناپید نہیں ہیں) اور پھر جب تصادم ہوتا تو آپ اس طرح ''ہوا'' میں نہ ہوتے جس طرح آج ہیں' بلکہ عوامی طاقت آپ کی پشت پر ہوتی اور یہ منظر نہ ہوتا کہ فوجی آمریت کا خطرہ سامنے آیا اور جماعت دبک گئی... اور جب دستور بننے لگا تو جو کچھ ملا' صبر و شکر کے ساتھ قبول کر لیا !

لہٰذا جہاں تک میری محدود عقل کام کرتی ہے' میں تو اس دلیل کو بھی بالکل بے وزن پاتا ہوں اور اولاً ------- یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خطرات اگر حقیقی ہوتے تب بھی ان کے باعث طریق کار کی تبدیلی کسی طرح صحیح نہیں تھی ----- -- اور ثانیاً ------- خطرات جتنے کچھ بیان کیے گئے وہ سب کے سب حقیقی نہیں تھے۔ وہ پیش ضرور آتے لیکن ایک عرصہ کے بعد۔ اس وقت تو وہ اصل میں ایک وہم اور زیادہ تر شیطان کا ایک ڈراوا تھے !

اصل سبب

سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر تمہارے خیال میں اس تبدیلی (بلکہ تمہاری رائے میں تحریک اسلامی کی ''راہ

راست سے انحراف'') کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب میرے ذمے ہے اور اس کا وعدہ میں ص ۱۱۷ پر بھی کر آیا ہوں۔

مَیں اگر ایک لفظ میں اس اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو وہ ایک لفظ ''عجلت پسندی'' ہے' لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ ذرا اس کی تفصیل بیان کر دوں۔ خصوصاً اس غرض سے کہ اس ''دورِ فتن'' میں جب کہ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں' کہیں میں بھی ان لوگوں کے زمرے میں شریک نہ سمجھا جائوں جو محض بیان حال ہی پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نیتوں تک کو زیر بحث لا کر فضا کو مکدر کر رہے ہیں۔

میری رائے میں عجلت پسندی کہنے کو تو ایسی چیز ہے جس کے بارے میں معمولی استعداد اور تھوڑی سی صلاحیت رکھنے والا شخص بھی فوراً کہہ دے گا کہ یہ ایک نہایت غلط اور بڑی مہلک چیز ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور انسان کا خمیر جس مٹّی سے اٹھا ہے اس میں ایک جزوِ لاینفک کے طور پر موجود ہے۔ یہ مفہوم جو میں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے' قرآن مجید کا بیان کردہ ہے۔{خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ} (۳۶) اور {وَ کَانَ الۡاِنۡسَانُ عَجُوۡلًا ﴿۱۱﴾} (۳۷) کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں حقیقت کے اعتبار سے معنی اور مفہوم کے دریا بند ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالعے سے معلوم

---

(۳۶) سورۃ الانبیاء' آیت ۳۷: ''بنا ہے آدمی جلدی کا'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۳۷) سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۱۱: ''اور ہے انسان جلد باز'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

ہوتا ہے کہ تمام گمراہی و ضلالت' گناہ و عصیان اور ردّ و انکار کا اصل سبب ''حب ِعاجلہ'' ہی ہے۔{کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ﴿۲۰﴾ وَ تَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ ﴿۲۱﴾} (۳۸) اور {اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ یُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَ یَذَرُوۡنَ وَرَآءَہُمۡ یَوۡمًا ثَقِیۡلًا ﴿۲۷﴾} (۳۹) اور اسی مضمون کی دوسری بہت سی آیات اسی مفہوم کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

اس ''حب ِعاجلہ'' کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ یہ بس کفار ہی میں ہوتی ہے' مومن و مسلم کے پاس بھی نہیں پھٹکتی' ایک شدید غلطی فہمی ہے۔ مومن در حقیقت وہ ہوتا ہے جو شعوری طور پر دنیا پرستی (یعنی حب ِعاجلہ) کو چھوڑ کر آخرت پرستی (یعنی حب ِآخرۃ) کو اختیار کرتا ہے' لیکن جب تک وہ انسان ہے اور بشری کمزوریاں اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں' یہ بنیادی کمزوری (عجلت پسندی) وقتاً فوقتاً اپنا مظاہرہ کراتی رہتی ہے اور انسانی قلب و دماغ کو مسحور کر کے گناہ' عصیان اور خطا کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے۔ بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ پیغمبر تک اس کی گرفت سے بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی خطا جو کچھ بھی تھی' اس کی بنیاد میں یہی عجلت پسندی کام کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ''عجلت'' اگرچہ رضائے الٰہی کی طلب اور ملاقات اور

کلام الٰہی کے اشتیاق کے غلبہ سے صادر ہوئی تھی لیکن پھر بھی یہ ان کی قوم کے بتلائے فتنہ ہونے کا سبب بن گئی: {وَ مَآ اَعۡجَلَکَ عَنۡ قَوۡمِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۸۳﴾ قَالَ ہُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیۡ وَ عَجِلۡتُ اِلَیۡکَ رَبِّ لِتَرۡضٰی ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡۢ بَعۡدِکَ وَ اَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾ }(۴۰) پھر لطف یہ ہے کہ

---

(۳۸) سورۃ القیامہ' آیت ۲۰: ''کوئی نہیں ! پر تم چاہتے ہو جو جلد ہو اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۳۹) سورۃ الانسان' آیت ۲۷: ''یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۰) سورۃ طٰہٰ' آیات ۸۳ تا ۸۵: ''اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ ؟ بولا وہ' یہ آرہے ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی آیا تیری طرف اے ربّ کہ تو راضی ہو۔ فرمایا ہم نے تو بچلا دیا تیری قوم کو تیرے پیچھے' اور بہکا دیا ان کو سامری نے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

واپس تشریف لا کر اس فتنہ پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پوری قوم اور خاص طور پر اپنے جانشین حضرت ہارون علیہ السلام کو سرزنش کی تو اس کے یہ الفاظ بھی قرآن مجید نے نقل فرمائے: {اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ ۚ}(۴۱) ۔ خود حضور نبی کریم ﷺ فداہ ابی و امی کے بارے میں قرآن مجید کے اشارات و کنایات واضح دلالت کرتے ہیں کہ مختلف مواقع پر آپ ﷺ کی طبع مبارک میں بھی اس کی طرف میلان پیدا ہوا' جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بروقت مامون و مصئون کیا۔

اوّل تو یہی ''تلقی وحی'' میں غلبۂ شوق کی بنا عجلت اور اس کے ٹھہر ٹھہر کر آنے پر طبع مبارک کا افسردہ ہونا' جس پر پہلے دن اور رات کی آیاتِ آفاقی سے (۴۲) استشہاد فرما کر {مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی ؕ ﴿۳﴾ }(۴۳) کی تسلی دی گئی۔ پھر کفار کے اس اعتراض کے جواب میں کہ قرآن مجید ایک بار ہی کیوں نازل نہیں ہو جاتا' ضمناً حضور ﷺ کو اس کی یہ حکمت بتائی گئی کہ{ کَذٰلِکَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ}(۴۴)پھر واضح طور پر یہ بھی فرمایا گیا کہ: {لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿۱۹﴾ } (۴۵) اور جب اس پر بھی شوق کا غلبہ باقی رہا تو نہ صرف یہ کہ مزید واضح ہدایت کی گئی کہ {وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ

(۴۱)سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۵۰: ’’کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے؟‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۲) {وَ الضُّحٰی ۙ﴿ ۱ ﴾ وَ الَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ﴿ ۲ ﴾ } (الضحیٰ) ’’قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۳)(الضحیٰ) ’’نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے نہ بیزار ہوا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۴)سورۃ الفرقان‘ آیت ۳۲: ’’اسی طرح اتارا تاکہ ثابت قدم رکھیں ہم اس سے تیرا دل۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۵)سورۃ القیامۃ‘ آیات ۱۶ تا ۱۹: ’’نہ چلا اس کے پڑھنے پر تو اپنی زبان تاکہ جلدی اس کو سیکھ لے۔ وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینے میں اور پڑھنا تیری زبان سے۔ پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتے کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔ پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتانا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿ ۱۱۴ ﴾ } بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی خطائِ اولین کا تذکرہ فرما کر ایک لطیف تنبیہہ فرما دی کہ {وَ لَقَدۡ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَ لَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا ﴿ ۱۱۵ ﴾ ٪} (۴۷)۔ ان آیات کے ضمن میں حضرت شاہ عبد القادر دہلوی ؒ کا یہ حاشیہ لائق توجہ ہے:

’’جبریل جب قرآن لاتے حضرتؐ ان کے پڑھنے کے ساتھ آپ بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جائوں۔ اس کو پہلے منع فرمایا تھا سورۃ القیامۃ میں {لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ ۱۶ ﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ ۱۷ ﴾ } اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ہمارے ذمہ ہے۔ لیکن بندہ بشر ہے‘ شاید بھول گئے ہوں‘ اس لیے پھر اس آیت سے تقید کیا اور بھولنے پر آگے مثل بیان فرمائی آدم کی۔‘‘ (بحوالہ حواشی کلام پاک مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی)

پھر سورۂ عبس میں جس واقعہ پر حضور ﷺ کو تنبیہہ فرمائی گئی‘ اس کی بنیاد میں بھی یہی عجلت پسندی کار فرما تھی۔ نبی اکرم ﷺ پر اس شوق کا غلبہ ہی تو تھا کہ دعوت حق جلد پھیلے اور لوگ جلد از جلد دائرۂ ایمان میں داخل ہوں جو اس کا سبب بنا کہ اس وقت رئوسائے قریش اور اکابر قوم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے‘ آپ ﷺ نے نابینا صحابی حضرت عبد اللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی جانب التفات نہ فرمایا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کا گمان تھا کہ یہ لوگ جو قوم میں از خود راہنمائی کے مقام پر فائز ہیں‘ ایمان لے آئیں تو ان کی پیروی میں پوری قوم ایمان قبول کر لے گی۔ سورۂ کہف میں پھر ایک بار اسی موضوع پر مفصل ہدایات دی گئیں اور اس خیال پر کہ ان اہلِ ثروت و وجاہت لوگوں کے ایمان لانے سے دعوتِ حق کے جلد اور بسرعت و عجلت پھیلنے کے امکانات روشن ہو جائیں گے‘ قدرے سخت الفاظ میں گرفت فرمائی گئی:

_____(۴۶) سورۃ طٰہٰ‘ آیت ۱۱۴: ’’اور تو جلدی نہ کر قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے اس کا اترنا اور کہہ اے رب زیادہ کر میری سمجھ۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۴۷) سورۃ طٰہٰ‘ آیت ۱۱۵: ’’اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے‘ پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ ہمت۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

{وَ اتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَ اصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَ کَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ } (۴۸)

دعوتِ حق کے دوران ایک غلطی جس کا امکان اسی عجلت پسندی کی سحر طرازیوں سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ بسا اوقات داعی اس طرز پر سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ لوگ پورے کے پورے دین اور ساری کی ساری شریعت کو مِن وعَن قبول نہیں کرتے تو فی الحال ان سے کسی قدر کم پر معاملہ کر لیا جائے تاکہ دعوت کے پھیلنے کے راستے جو اس وقت بالکل مسدود نظر آ رہے ہیں‘ ایک بار کھل تو جائیں۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں کو پورے کے پورے حق کے قبول کرنے پر آمادہ کر لیا جائے گا۔ اس طرح اس معاملہ میں عجلت مداہنت کو جنم دیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ فداہ ابی و امی کو دعوت کے بالکل ابتدائی مرحلے میں اس خطرے سے خبردار فرما دیا گیا کہ{فَلَا تُطِعِ الْمُکَذِّبِیْنَ ﴿ ۸ ﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْہِنُ فَیُدْہِنُوْنَ ﴿ ۹ ﴾ } (۴۹)۔ پھر مختلف مراحل میں جب دعوت حق کی جلد اشاعت اور دین حق کے جلد برپا ہونے کی تمنا نے‘ جو خالصتاً ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی پر مبنی تھی‘ اس صلح جوئی اور مداہنت کی جانب مائل ہونے کا امکان پیدا کیا‘ وحی الٰہی بر وقت حضور ﷺ کی راہنمائی فرماتی رہی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں کس قدر وضاحت کے ساتھ متنبہ فرمایا گیا:

_____(۴۸) سورۂ کہف‘ آیات ۲۷‘ ۲۸: ’’اور پڑھ جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کی باتیں اور نہ کہیں پائے گا تو اس کے سوا چھپنے کی جگہ۔ اور روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام۔ طالب ہیں اس کے منہ کے اور نہ دوڑیں تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق زندگانی دنیا کی اور نہ کہا مان اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے‘ اور پیچھے پڑا ہوا ہے اپنی خواہش کے اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۴۹) سورۃ القلم‘ آیات ۸‘ ۹: ’’سو تو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا۔ وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

{وَ اِنۡ کَادُوۡا لَیَفۡتِنُوۡنَکَ عَنِ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ لِتَفۡتَرِیَ عَلَیۡنَا غَیۡرَہٗ ۫ۖ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوۡکَ خَلِیۡلًا ﴿۷۳﴾وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰکَ لَقَدۡ کِدۡتَّ تَرۡکَنُ اِلَیۡہِمۡ شَیۡئًا قَلِیۡلًا ﴿۷۴﴾اِذًا لَّاَذَقۡنٰکَ ضِعۡفَ الۡحَیٰوۃِ وَ ضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیۡنَا نَصِیۡرًا ﴿۷۵﴾ }(۵۰)

ہجرت کے بعد جب بنی اسرائیل سے سابقہ پیش آیا اور انہوں نے بھی پورے حق کے قبول کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ فرما دیا گیا کہ: {وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ}(۵۱)

ان تمام خطرات و خدشات اور بشری تقاضوں سے پیدا ہونے والی عجلت پسندی پر بر وقت متنبہ کرنے کے ساتھ مسلسل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کی جاتی رہی۔ اکثر و بیشتر مکی سورتوں کا اختتام اسی صبر و استقامت کی تاکید پر ہوتا ہے۔ سورۃ المدثر کی انتہائی جامع ہدایت{وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ؕ ﴿۷﴾ }(۵۲) کے بعد سورۃ المزمل میں {وَ اصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ} (آیت۱۰)(۵۳) ‘ سورۃ الانسان میں {فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ}(آیت۲۴)(۵۴) سورۃ القلم میں {فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَ لَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ ۘ}(آیت۴۸) (۵۵)

---

(۵۰) سورۃ بنی اسرائیل‘ آیات ۷۳ تا ۷۵: ’’اور وہ لوگ تو چاہتے تھے کہ تجھ کو بچلا دیں اس چیز سے کہ جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف تاکہ جھوٹ بنا لائے تو ہم پر وحی کے سوا‘ اور تب تو بنا لیتے تجھ کو دوست۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو سنبھالے رکھا تو تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا۔ تب تو ضرور چکھاتے ہم تجھ کو دُونا مزا زندگی میں اور دُونا مرنے میں‘ پھر نہ پاتا تو اپنے واسطے ہم پر مدد کرنے والا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۵۱) سورۃ البقرہ‘ آیت ۱۲۰: ’’اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۵۲) ’’اور اپنے رب سے امید رکھ۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۵۳) ’’اور سہتا رہ جو کچھ کہتے ہیں۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۵۴) ''سو تو انتظار کر اپنے رب کے حکم کا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۵۵) ''اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اور سورۃ المعارج میں {فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۵﴾} (۵۶) کی بار بار تاکید ------- اور پھر ہر مرحلے پر اسی کی نصیحت کہ{وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚ} (۵۷) اور{فَاصۡبِرۡ ؕ اِنَّ الۡعَاقِبَۃَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۹﴾} (۵۸) اور {وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ} (۵۹) اور {وَ اصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعۡیُنِنَا} (۶۰) کی تشفی آمیز تلقین اور {فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ} (۶۱) {وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾} (۶۲) کی امید افزا نصیحت اسی ''عجلت پسندی'' کی سحر طرازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی تو تھیں۔ اس سلسلے میں سورۃ الشوریٰ کی مندرجہ ذیل آیت تو انتہائی واضح اور ہر داعی حق کے لیے ایسی ابدی ہدایت کی حامل ہے کہ جن پر پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ہوئے بغیر کبھی دعوتِ حق کامیابی کے مراحل تک نہیں پہنچ سکتی۔

{فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنۡ کِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۵﴾} (۶۳)

اس موضوع پر اس قدر تفصیلی گفتگو میں نے اس لیے کی ہے کہ جب میں نے تحریک

---

(۵۶) ''سو تو صبر کر، بھلی طرح کا صبر کرنا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۵۷) سورۃ یونس، آیت ۱۰۹: ''اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک فیصلہ کرے اللہ۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۵۸) سورۃ ہود، آیت ۴۹: ''سو تو صبر کر۔ البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۵۹) سورۃ النحل، آیت ۱۲۷: ''اور تو صبر کر، اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۶۰) سورۃ طور، آیت ۴۸: ''اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا۔ تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۶۱) سورۃ الروم، آیت ۶۰ ''سو تو قائم رہ، بے شک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)
(۶۲) سورۃ ہود، آیت ۱۱۵: ''اور صبر کر، البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۶۳) سورۃ الشوریٰ، آیت ۱۵: ''سو تو اسی کی طرف بلا اور قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو، اور مت چل ان کی خواہشوں پر اور کہہ میں یقین لایا اس کتاب پر جو اتاری اللہ نے، اور مجھ کو حکم ہے کہ>

جماعت اسلامی کے غلط رخ پر مڑ جانے اور قیام پاکستان کے بعد اصل تحریک کی بساط کو تہہ کر کے ایک سیاسی اور قومی جدّوجُہد میں اپنے آپ کو جھونک دینے کی اصل وجہ عجلت پسندی بتائی ہے تو کہیں اسے ایک ''گالی'' سمجھ کر طبائع مکدر نہ ہو جائیں بلکہ یہ محسوس کیا جائے کہ یہ نفس انسانی کی ایک بنیادی کمزوری ہے اور اس سے بڑے سے بڑے لوگ بھی بالکل بچ نہیں سکے ہیں۔ حتیٰ کہ اولوالعزم پیغمبروں کو اس سے بار بار متنبہ کیا گیا ہے اور بارہا عین وقت پر ان کی راہنمائی کی گئی ہے، مبادا اس کے پھندے میں گرفتار ہو جائیں۔ انسانوں میں اس کے سحر و افسوں سے بچنے میں مدارج کا فرق ضرور ہے لیکن اس سے بالکلیہ بچنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک انسان سے اس کی بشریت بالکل ہی سلب نہ ہو جائے اور وہ ملکوتیت محض ہی کا پتلا بن کر نہ رہ جائے۔

دُور کی باتیں چھوڑیئے، ابھی تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اسی برصغیر پاک و ہند میں جو دعوتِ حق اٹھی تھی، جسے خود آپ نے ''ہندوستان کی پہلی تحریک اسلامی'' (۶۴) تسلیم کیا تھا اور جس کے راہنمائوں اور کارکنوں کے خلوص، تقویٰ، للّٰہیت اور اعلاءِ کلمۃ الحق کی خاطر ایثار، قربانی اور تکالیف پر صبر نے خود آپ کے قول کے مطابق صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی یاد تازہ کر دی تھی، اس کی ناکامی کے اسباب کے بارے میں خود آپ ہی نے یہ تشخیص فرمائی تھی کہ انہوں نے جلد بازی سے کام لیا اور ایک ایسے خطے میں کہ جہاں کے عوام کو ذہنی اور اخلاقی طور پر پوری طرح اس کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا، شریعت اسلامی کو نافذ کر دیا۔ نتیجتاً ایک ردِّ عمل رونما ہوا اور سارے کام پر پانی پھر گیا۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ تحریک اسلامی کے لیے ایک بظاہر آسان اور مختصر راستہ (شارٹ کٹ) دفعتاً

_____>انصاف کروں تمہارے بیچ میں۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا۔ ہم کو ملیں گے ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام۔ کچھ جھگڑا نہیں ہم میں اور تم میں۔ اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۶۴) مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی تحریک مجاہدین پر تصنیف کا نام

نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس آسان اور مختصر راستے کے سامنے آنے کے دو پہلو تو میں بیان کر ہی چکا ہوں' یعنی :

- ایک یہ کہ قیادت کے میدان میں ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو اقتباس مندرجہ بر ص ۱۰۹۔۱۱۰)

- دوسرے یہ کہ ایک نئی مملکت بنی تھی' جس کا دستور ابھی بننا تھا اور اس کو ابتدا ہی میں صحیح بنیادوں پر بنوا لینا بعد میں اس کو بدلوا کر صحیح کرنے سے زیادہ آسان نظر آتا تھا۔

اس پر اضافہ کچھ اور امور سے ہو گیا' جن میں سب سے اہم یہ کہ مغربی پاکستان سے ایک بہت بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کا انخلا ہوا اور اس وسیع خطہ ارضی میں مسلمان ہی مسلمان رہ گئے۔ اس سے یہ راہ اور بھی آسان نظر آنے لگی اور محسوس ہوا کہ اسلام کی راہ کی ایک بہت بڑی رکاوٹ اللہ تعالیٰ نے راستے سے ہٹا دی ہے۔ اب یہاں جو لوگ ہیں ان کی واضح اکثریت بہر حال مسلمان ہے اور اس کے دل میں اسلام کی محبت کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے۔ خاص طور پر اس وقت دس پندرہ سال کی قومی تحریک نے اس محبت یا کم از کم اس محبت کے اظہار کو جلا دے دی ہے۔ لہٰذا اس وقت ان کی محبت کو خواہ وہ محض جذباتی اور سطحی ہی ہو' کام میں لا کر اس مملکت کے دستور کو صحیح بنیادوں پر اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی محبت کے بل پر اور کچھ اس بنا پر کہ قیادت میں ایک ''خلا'' بہر حال پیدا ہو گا' انقلابِ قیادت کا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بڑھو اور اس شارٹ کٹ سے اقتدار ہاتھ میں لے کر نیچے سے اوپر کی طرف ایک فطری طریقہ پر انقلاب لانے کا کھکھیڑ مول لینے کی بجائے اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانے کا ایک موقع جو مل رہا ہے' اس سے فائدہ اٹھا لو۔

میری حقیر رائے میں اس وقت جماعت اسلامی کی قیادت کی ذہنی کیفیت کم و بیش اسی طرز کی تھی۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اس کے سوا کسی اور بُری نیت یا malafide کو برسر کار نہیں پاتا۔ اسے غلطی میں

ضرور سمجھتا ہوں لیکن اس غلطی کو میں جذبۂ عجلت پسندی پر محمول کرتا ہوں، کسی بُری نیت یا ارادے پر مبنی نہیں سمجھتا!

یہ غلطی جب ایک بار ہو گئی تو پھر اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس پر کچھ اپنے ضمیر کو، کچھ جماعت کے کارکنوں کو اور کچھ عوام کو مطمئن کیا جائے۔ اس لیے کہ ''غلطی'' کرتے ہوئے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ ''نفسِ لوامہ'' (٦٥) جس کی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، اتنی حقیر اور بے بضاعت چیز نہیں ہے کہ ایسے موقع پر خاموش رہ جائے۔ غلطی اور خطا کے موقع پر وہ انسان کو لازماً متنبہ کرتا ہے کہ{اَیۡنَ تَذۡہَبُوۡنَ}(٦٦) لیکن حب عاجلہ کے تحت جب انسان اس غلطی کے ارتکاب کا فیصلہ کر ہی لے تو پھر{وَّ لَوۡ اَلۡقٰی مَعَاذِیۡرَہٗ ﴿ؕ۱۵﴾}(٦٧) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور بڑے ہی خوشنما اور جاذبِ نظر دلائل و براہین کا ایک انبار ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے تیار ہو جاتا ہے اور بعینہٖ یہی ہوا۔ دلائل تیار ہوئے، ان کے ذریعے پہلے اپنے آپ کو مطمئن کیا گیا، پھر آس پاس کے لوگوں کو اطمینان دلایا گیا اور آخر کار پبلک میں انہی دلائل و شواہد کی بنا پر اپنا مقدمہ پیش کر دیا گیا۔

جب ایک مرتبہ انسان غلط راہ پر جا پڑے تو یہ ایک دلخراش مگر زندہ حقیقت ہے کہ پھر رفتہ رفتہ انسان کی اپنی فکر و نظر کے زاویے اور سانچے اسی رخ پر ڈھل جاتے ہیں۔ سوچنے کا معیار بدل جاتا ہے اور غور و فکر کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک قدم دوسرے اقدام کے لیے وجہ جواز فراہم کرتا ہے۔ ایک غلطی منطقی طور پر دوسری بے شمار غلطیوں کے لیے دروازے کھولتی ہے اور استدلال کی ایک غلط کڑی آگے کی ساری کڑیوں کو غلط بنا کر رکھ دیتی ہے۔ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

اس کے بعد اگر کبھی کھٹک محسوس ہوتی بھی ہے تو وہ اس طرح دفع کی جاتی ہے کہ

(٦٥) سورۃ القیامہ: {لَآ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ﴿۱﴾ وَ لَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ﴿۲﴾} ''مَیں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے برائی پر۔'' (ترجمہ شیخ الہندؒ) (٦٦) ''تم کدھر جا رہے ہو؟''
(٦٧) سورۃ القیامہ: ''اور پڑا ڈالے اپنے بہانے''

کیا کریں' اب چونکہ یہ اقدام کیا جا چکا ہے لہٰذا یہ کرنا بھی ناگزیر ہے اور ایک مجبورانہ احساس کے ساتھ انسان اس راہ پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں غلط رخ پر سفر جاری رہتا ہے' اسی پر انشراح صدر بھی ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ع

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

جو باتیں پہلے بالکل غلط تھیں' اب درست ہو جاتی ہیں۔ جو ناممکن تھیں' اب ممکن سمجھی جاتی ہیں اور آخر کار انسان اپنی تباہی وہلاکت کا سارا سامان خود فراہم کر کے بھی اس امید پر بیٹھا ہوتا ہے کہ کامیابی قریب آ رہی ہے اور منزل مقصود اب قدم بوسی کیا چاہتی ہے۔

مجھے تو {فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ﴿۱۰﴾} (٦٨) کی بھی یہی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔

- اور میری رائے میں یہی جماعت اسلامی کے ساتھ ہوا۔
- یہی اب ہو رہا ہے۔

اور

- آئندہ بھی اگر ایک جرأت رندانہ کے ساتھ ماضی و حال کا بے لاگ تجزیہ نہ کیا گیا اور پوری ہمت‘ عزیمت‘ دلیری -----لومۃ لائم سے بے خوفی‘ استہزا اور تمسخر سے بے پرواہی ----- {فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ ؕ} (۶۹) ----- {سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ} (۷۰) ----- اور {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ} (۷۱) کی شان کے ساتھ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کی گئی تو -----چاہے ہم اسے کتنا ہی مبغوض جانیں‘ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت بہرحال پوری ہو کر رہے گی!

---

(۶۸) سورۃ اللیل‘ آیت ۱۰: ’’سو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں۔‘‘ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

(۶۹) سورۃ الذاریات‘ آیت ۵۰: ’’سو بھاگو اللہ کی طرف۔‘‘

(۷۰) سورۃ الحدید‘ آیت ۲۱: ’’دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف۔‘‘

(۷۱) سورۃ التحریم‘ آیت ۸: ’’اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی طرف‘ صاف دل کی توبہ۔‘‘

خاتمہ

ابھی اس تحریر کا مثبت پہلو باقی ہے‘ یعنی یہ کہ اب کیا اور کس طرح کیا جانا چاہیے۔ لیکن میں اس وقت اس کے بیان میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا! اس لیے کہ اس کا فائدہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اس وقت جب کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور موقف کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو میں نے پیش کیا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر اول تو میرے بیان کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جماعت کے اکابرین اس نقطۂ نظر سے خود ہی غور و فکر کریں تو ان کو اللہ تعالیٰ نے مستقبل کے لیے لائحۂ عمل تجویز کرنے کی صلاحیت مجھ سے تو بلامبالغہ لاکھوں درجہ زیادہ دی ہے‘ لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کر دوں گا۔

ویسے بھی یہ کسی ایک فرد یا چند افراد کے سوچ بچار کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس پر تو جماعت کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور غور و فکر کرنا ہو گا۔ تلافی مافات افراد کے لیے ہی آسان نہیں ہوتی' یہ تو ایک تحریک کا معاملہ ہے! آئندہ کے لیے میری نگاہ میں اگر کوئی روشن امکان ہے تو محض اس صورت میں کہ جماعت کے تمام اصحاب فکر ماضی کی غلطی کے شعوری اعتراف کے بعد آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تجویز کرنے کی متفقہ کوشش کریں۔

وَ آخِرُ دَعوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِینx رَبَّنَا لا تُزِغْ قُلوبَنَا بَعدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَ ھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ

خاکسار ڈاکٹر اسرار احمد

* * *

ضمیمہ

تین قرار دادیں

____(۱)____

راقم الحروف کی قرار داد جو اجتماعِ ارکان ماچھی گوٹھ میں پیش کی گئی:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَیں تجویز کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان حسب ِذیل قرارداد پاس کرے:

''جماعت اسلامی پاکستان کا یہ اجتماعِ ارکان بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۴۷ء میں پاکستان میں نظام اسلامی کے قیام کے لیے جو طریق کار جماعت نے اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریق کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ یہ طریق کار اپنے سابقہ طرزِ عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیۃً درست ثابت نہ ہو سکے۔ اس طریق کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدّوجُہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں

اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدّوجُہد کے مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے۔ اس جدّوجُہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور متزلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلہ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں۔ اس عرصے میں نہ تو عوام کی اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری وذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی' اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدّوجُہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص و للہیت کے ایک حصے کا ضیاع برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی' اصولی' اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑی ہے۔

موجودہ طریق کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماعِ ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدّوجُہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آسکتے ہیں وہ ان تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریق کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آسکتے ہیں۔

بنا بریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریق کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریق کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دارومدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ لائحہ عمل تجویز کرنے کے لیے جماعت کے اربابِ حل و عقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں۔''

اسرار احمد عفی عنہ

رکن منٹگمری

------ (۲) ------

مرکزی مجلس شوریٰ منعقدہ نومبر/دسمبر ۱۹۵۶ء کی قرارداد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان دو ہفتوں کے مسلسل غور و خوض کے بعد ان تمام مسائل و معاملات کے متعلق جو جماعت کے پچھلے کام، آئندہ لائحۂ عمل اور عام حالات کے بارے میں جائزہ کمیٹی رپورٹ کے ذریعے سے زیر بحث آئے تھے، حسب ذیل نتائج پر پہنچی ہے:

۱۔ جماعت نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد اب تک جو کام کیا ہے اس کے متعلق مجلسِ شوریٰ اس بات پر مطمئن ہے کہ جماعت اپنے اصول، مسلک اور بنیادی پالیسی سے منحرف نہیں ہوئی ہے۔ البتہ تدابیر کے صحیح اور غلط ہونے کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں اور صحیح قرار دینے کی صورت میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفید نتائج کے ساتھ بعض مضر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں، جنہیں رفع کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ مجلسِ شوریٰ کی رائے میں جو لائحۂ عمل ۱۹۵۱ء کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور جو اب تک جماعت اسلامی کا لائحہ عمل ہے وہ اصولاً بالکل درست ہے' اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ لیکن مجلسِ شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ دستورِ اسلامی کی پیہم جدّوجُہد کی وجہ سے لائحۂ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لیے خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا ہے اور اس کے باعث ہمارے بنیادی کام میں بہت بڑی کسر رہ گئی ہے۔ اس لیے مجلس کی متفقہ رائے یہ ہے کہ جماعت کی بنیادی دعوت اور لائحۂ عمل کے

پہلے تین اجزاء کی طرف اب پوری توجّہ اور کوشش صرف کرنے کی ضرورت ہے اور اس بنا پر سردست کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا قبل از وقت ہو گا۔ البتہ اسلامی اقدار کے قیام و بقا اور دستورِ اسلامی کے تحفظ' اصلاح اور نفاذ کے لیے ناگزیر اقدامات سے دریغ نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ مجلس کی رائے میں نظامِ جماعت کے اندر اصل حجت کتاب و سنت ہے اور اس کے بعد آئینی سند ہونے کی حیثیت جماعتی لٹریچر کی عبارات کو نہیں بلکہ دستورِ جماعت اور ان جماعتی فیصلوں کو حاصل ہے جو دستور کے مطابق جماعت کے مجاز اداروں (امارت' مجلسِ شوریٰ اور ارکان کے اجتماع عام) نے کیے ہوں۔ البتہ لٹریچر ایک مستقل ذریعہ دعوت ہے اور رہے گا۔ اگر جماعتی فیصلوں میں کوئی چیز لٹریچر کے کسی مضمون سے مختلف پائی جائے تو وہ یا تو اس مضمون کی ناسخ ہو گی' یا اس مضمون کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو جماعتی فیصلوں کے مطابق ہوں۔

۴۔ جائزہ کمیٹی کے ذریعے سے جماعت کے جو اصلاح طلب حالات و معاملات مجلس کے سامنے آئے ہیں ان کے حقیقی اسباب مشخص کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر تجویز کرنے کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا گیا ہے جو امیر جماعت' مولانا امین احسن صاحب' چودھری غلام محمد صاحب اور نعیم صدیقی صاحب پر مشتمل ہو گی۔ علاوہ بریں جائزے کے دوران میں جن متعین واقعات کی نشاندہی مختلف مقامات پر جائزہ کمیٹی کے سامنے کی گئی ہے' ان کی تحقیقات اور اصلاح کے لیے مجلسِ شوریٰ نے مناسب طریقہ تجویز کر دیا ہے' جس کے مطابق حتی الامکان جلدی کارروائی کی جائے گی۔

------ (۳) ------

اجتماع ارکان ماچھی گوٹھ میں پاس شدہ قرارداد

جماعت اسلامی پاکستان اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتی ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جس نصب العین کو سامنے رکھ کر اور جن اصولوں کی پابندی کا عہد کر کے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا' آج تک وہ اسی منزل مقصود کی طرف انہی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے دوران میں اگر اس سے اقامتِ دین کے مقصد کی خدمت بن آئی ہے تو وہ سراسر اللہ کا فضل ہے' جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہے' اور اگر کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں اس سے سرزد ہوئی ہیں تو وہ اس کے اپنے ہی قصور کا نتیجہ ہیں' جن پر وہ اپنے مالک سے عفو و درگزر اور مزید ہدایت و توفیق کی دعا کرتی ہے۔

جماعت اسلامی اس بات پر مطمئن ہے کہ تحریک اسلامی کا جو لائحۂ عمل نومبر ۵۱ء میں ارکان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں امیر جماعت نے مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے پیش کیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصد تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور وہی آئندہ بھی اس تحریک کا لائحۂ عمل رہنا چاہیے۔

اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء (یعنی تطہیر افکار و تعمیر افکار' صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت اور اجتماعی اصلاح کی سعی) تو جماعت اسلامی کی تشکیل کے پہلے ہی دن سے اس کے لائحہ عمل کے اجزائِ لازم رہے ہیں' البتہ ان کو عمل میں لانے کی صورتیں حالت و ضروریات کے لحاظ سے اور جماعت کے وسائل و ذرائع کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اب یہ طے کرتی ہے کہ آئندہ کوئی دوسرا جماعتی فیصلہ ہونے تک

ان تینوں اجزاء کو اس پروگرام کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ(۷۲) شامل کیا جا رہا ہے۔ نیز جماعت کا یہ اجتماع عام مجلس شوریٰ اور تمام حلقوں' اضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس پروگرام پر اس حد تک زور دیں کہ لائحۂ عمل کے چوتھے جزو کے ساتھ جماعت کے کام کا ٹھیک توازن قائم ہو جائے اور قائم رہے۔

اس لائحۂ عمل کا چوتھا جزو نظامِ حکومت کی اصلاح سے متعلق ہے' اور در حقیقت وہ بھی ابتدا ہی سے جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت نے ہمیشہ اس سوال کو زندگی کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن سوال سمجھا ہے کہ معاملاتِ زندگی کی زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں ہے یا فاسقین کے ہاتھ میں' اور حیاتِ دنیا میں امامت و راہنمائی کا مقام خدا کے مطیع فرمان بندوں کو حاصل ہے یا اس کی اطاعت سے آزاد رہنے والوں کو۔ جماعت کا نقطۂ نظر ابتدا سے یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک اقتدار کی کنجیوں پر دین کا تسلط قائم نہ ہو جائے اور جماعت ابتدا ہی سے یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھتی ہے کہ دین کا یہ تسلط یک لخت کبھی قائم نہیں ہو سکتا' بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غیر دینی نظام کے مقابلے میں دینی نظام چاہنے والوں کی پیہم کشمکش اور درجہ بدرجہ پیش قدمی سے ہی مکمل ہوا کرتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اس مقصد کے لیے تقسیم ہند سے پہلے اگر عملاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ مواقع کا فقدان اور ذرائع کی کمی بھی تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت کے نظام میں اس مقصد کے لیے کام کرنے میں بعض شرعی موانع تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مواقع اور ذرائع دونوں فراہم کر دیئے اور شرعی موانع کو دور کرنے کے امکانات بھی پیدا کر دیئے تو جماعت نے اپنے لائحہ عمل میں اس چوتھے جزو کو بھی' جو اس کے نصب العین کا ایک لازمی تقاضا تھا' شامل کر لیا۔ اس میدان میں دس سال کی جدّوجُہد کے بعد اب غیر دینی نظام کی حامی طاقتوں کے مقابلے میں دینی نظام کے حامیوں کی پیش قدمی ایک اہم مرحلے

_____(۷۲) ضمیمہ کی کاپیاں امرائے اضلاع کو دے دی گئی ہیں' ان سے دیکھ لی جائیں۔

تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کے دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوائے جا چکے ہیں اور ان منوائے ہوئے اصولوں کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانے کا انحصار اب قیادت کی تبدیلی پر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت بروئے کار لانے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس لائحۂ عمل کے چاروں اجزاء پر توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے' کہ ہر جزو کا کام دوسرے جزو کے لیے موجب تقویت ہو اور جتنا کام پہلے تین اجزاء

میں ہوتا جائے‘ اس نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزو کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا۔ (۷۳)

علاوہ بریں چونکہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے‘ اور پاکستان میں اس اصلاح و انقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے اور وہ ہے انتخابات کا راستہ‘ اس لیے جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہر حال نہیں رہ سکتی‘ خواہ وہ ان میں بلا واسطہ حصّہ لے یا بالواسطہ۔ رہا یہ امر کہ انتخابات میں کس وقت‘ کس طرح حصّہ لیا جائے‘ اس کو جماعت اپنی مجلسِ شوریٰ پر چھوڑتی ہے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔

* * *

_____(۷۳) یاد رہے کہ یہ جلی الفاظ شوریٰ کی قرارداد میں نہیں ہیں بلکہ عین اجتماع عام میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تقریر کا توڑ کرنے کے لیے مولانا مودودی صاحب نے قرارداد میں ان الفاظ کا اضافہ فرمایا تھا۔

1956-57ء میں جماعت اسلامی میں پالیسی اور نظم جماعت کے بارے میں جو شدید اختلاف رونما ہوا تھا‘ جس کے نتیجے میں ڈاکٹر اسرار احمد سمیت بہت سے عام ارکان اور مولانا عبد الجبار غازی‘ مولانا امین احسن اصلاحی‘ مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد ایسے اکابر سمیت جماعت کی قیادت کی پوری صف ِدوم جماعت سے علیحدہ ہو گئی تھی‘ اس کے

حقائق و واقعات پر مشتمل

بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی اہم تالیف

تاریخ جماعت اسلامی
کا ایک گمشدہ باب

مکتبہ خُدّام القُرآن لاھور
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501(042)
email:maktaba@tanzeem.org

مولانا مودودی مرحوم اور مَیں

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب سے

عرضِ ناشر
ص216

باب اوّل

میرے پہلے سفر امریکہ کے بعض حالات و واقعات' اور
مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش' اور
ان کی نمازِ جنازہ میں شمولیت کی سعادت
ص217

باب دوم

مولانا مودودیؒ کے ساتھ
میرے تعلق کا ابتدائی دور
ص233

باب سوم

''یادِ یارِ مہرباں آید ہمے''
ص253

عرضِ ناشر

''مولانا مودودی مرحوم اور میں'' کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ایک مفصل مضمون کی تسوید کا آغاز مولانا کی وفات کے تین سال بعد اگست ۱۹۸۲ء میں کیا تھا۔ ستمبر اور اکتوبر ۱۹۸۲ء کے میثاق کے شماروں میں اس سلسلے کی دو خاصی طویل اقساط شائع ہوئیں اور اس کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر ٹھیک دس برس بعد' ستمبر ۱۹۹۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلۂ مضمون کو آگے بڑھایا اور دو نسبتاً مختصر اقساط میں اس مضمون کو سمیٹتے ہوئے بحث کو مکمل کر دیا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے' یہ مضمون مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے ذاتی احساسات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ جماعت اسلامی کے وابستگان میں سے اکثر محترم ڈاکٹر صاحب کو مولانا مودودی مرحوم اور ان کی جماعت یعنی جماعت اسلامی کے شدید ناقدوں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک دور میں محترم ڈاکٹر صاحب نے مولانا مودودی مرحوم کے بعض اقدامات اور جماعت اسلامی کی بعض پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ اُس دور کے تحریر کردہ سیاسی تجزیوں میں تلخی کا رنگ غالب ہے' لیکن یہ ایک وقتی معاملہ تھا جو زیادہ دیر برقرار نہیں رہا۔ چنانچہ جیسا کہ امیر تنظیم اسلامی نے اپنی کتاب ''اسلام اور پاکستان'' کے دیباچے میں تحریر کیا ہے' مولانا مرحوم کے ساتھ ان کے ذہنی و قلبی تعلق میں شدید نوعیت کے اتار چڑھاؤ کا معاملہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے:

''... مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے' اس لیے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدّت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبّت و عقیدت کے ساتھ ہوا' جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدّت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی' لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آگیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔''

زیر نظر کتابچے میں جو مضامین شامل ہیں وہ چونکہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات کے تین سال بعد بلکہ ان میں سے بعض تیرہ سال بعد تحریر کیے گئے ہیں ' لہٰذا بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کی حقیقی عکاسی انہی مضامین کے ذریعے ہوتی ہے !

اگست ۱۹۹۴ء

ناظم مکتبہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

باب اوّل

میرے پہلے سفر امریکہ کے بعض حالات و واقعات اورمولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش

اوران کی نمازِ جنازہ میں شمولیت کی سعادت

(شائع شدہ 'میثاق' ستمبر ۱۹۸۲ء' بعنوان 'مولانا مودودی مرحوم اور مَیں')

یہ آج سے ٹھیک تین سال قبل کا ذکر ہے۔

اگست ۱۹۷۹ء کا وسط تھا اور رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کا آخری عشرہ شروع ہونے والا تھا جب میرے پہلے سفر امریکہ کی تیاری مکمل ہوئی۔ اور امید واثق ہوئی کہ اگر کوئی نادیدہ رکاوٹ پیش نہ آ گئی تو میں ہفتہ عشرہ میں بالٹی مور پہنچ جائوں گا۔ اندریں حالات ایک روز اچانک ایک خیال ذہن میں بجلی کی طرح کوندا ----- آج کل مولانا مودودی بھی امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔ کاش کہ وہاں ان سے ملاقات کی صورت نکل آئے ! اُس وقت تک امریکہ کے جغرافیہ کے بارے میں میری معلومات بس موٹی موٹی باتوں تک ہی محدود تھیں اور اس کی ریاستوں اور شہروں کے محلِ وقوع کے بارے میں تفصیلی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں' لہٰذا کچھ اندازہ نہ تھا کہ میرا امریکہ کے جن جن شہروں میں جانے کا پروگرام تھا' بفلو جہاں مولانا کا قیام تھا ان میں سے کسی کے آس پاس واقع ہے یا نہیں' اور وہاں بآسانی جانا ممکن ہو گا یا نہیں' تاہم ایک خواہش تھی جو مسلسل زور پکڑتی چلی گئی یہاں تک کہ اس نے ''ارادے'' کی صورت اختیار کر لی کہ حتی الامکان اس سفر کے دوران مولانا سے ملاقات کی کوشش کروں گا ----- اس پر فطری طور پر بہت سی بھولی بسری باتیں بھی ذہن میں تازہ ہوئیں اور بہت سے سوئے ہوئے جذبات و احساسات بھی ازسرِ نو بیدار ہوئے اور فی الجملہ قلب و ذہن پر اس کیفیت کا تسلط سا ہو گیا جو اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎

''ترکِ تعلّقات بھی عین تعلّقات ہے
آگ بجھی ہوئی نہ جان' آگ دبی ہوئی سمجھ !''

ان کیفیات میں جب کبھی یہ خیال آتا تھا کہ مولانا سے یہ ملاقات پورے سو سترہ سال بعد ہو گی تو ایک عجیب سی حسرت آمیز مسرّت کا احساس ہوتا تھا جس کی تعبیر الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے پورے سترہ سال ملاقات کیوں نہ کی ----- بلکہ پورے بارہ سال سے ایک ہی شہر میں زیادہ سے زیادہ تین چار میل کے فاصلے پر مقیم ہوتے ہوئے بھی ملاقات کا خیال کیوں نہ آیا ----- اور اب اچانک کرۂ ارضی کے بالکل دوسری جانب دیارِ غیر میں ملاقات کا اشتیاق اس قدر شدّت سے کیوں پیدا ہوا؟ ------ تو اصل میں اسی سوال کا جواب ہے جو اس تحریر کے ذریعے دیا جانا مقصود ہے۔ اگرچہ اس کے لیے قارئین کو ذرا صبر سے کام لینا ہو گا۔

لاہور سے ہفتہ ۱۸؍ اگست ۱۹۷۹ء کی شام اور کراچی سے ۲۱؍ اگست کو علی الصبح ڈیڑھ بجے روانہ ہو کر مَیں اسی تاریخ کی رات کو ساڑھے نو بجے امریکہ میں اپنے پہلے ''مقام'' بالٹی مور جا پہنچا۔ اس سفر کے بعض نہایت دلچسپ واقعات مَیں ایک ''رودادِ سفر'' کی صورت میں تحریر کر چکا ہوں جو ''میثاق'' کے جنوری' فروری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بہرحال بالٹی مور میں مَیں نے اپنے میزبانوں سے اوّلین معلومات جو حاصل کیں وہ بفلو ہی کے بارے میں تھیں' اور میرے دل کی کلی ایک دم کِھل اُٹھی اور اُمیدوں کے چراغ دفعۃً روشن ہو گئے جب مجھے معلوم ہوا کہ بفلو ٹورنٹو سے' جہاں مجھے اپنے اس سفر کے دوران سب سے طویل قیام کرنا تھا' صرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے

اور وہاں سے بفلو آنا جانا بآسانی ایک دن میں ہو سکتا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۷۹ء تک بالٹی مور واشنگٹن ایریا میں قیام کے بعد' دو دن ڈلاس میں اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن کی نذر کر کے ۳؍ ستمبر کو ٹورنٹو پہنچا تو وہاں بھی اولین معلومات مولانا ہی کے بارے میں حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے۔ تاہم مقامی ''حلقۂ احبابِ اسلامی'' (۱) کے رفقاء کا مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق سے مسلسل رابطہ قائم ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی ملاقات کی صورت پیدا کر لی جائے گی ------- ایک دو روز بعد معلوم ہوا کہ مولانا کی انتڑیوں کی تکلیف بڑھ گئی تھی جس کے باعث ایک بڑا آپریشن کرنا پڑا اور اب ان سے ملاقات لگ بھگ دو ہفتے کے بعد ہی ممکن ہو گی۔ اس سے فوری طور پر تو امید کے چراغ کچھ بجھتے سے محسوس ہوئے لیکن ساتھ ہی اللہ کا شکر بھی قلب کی گہرائیوں سے ابھرا کہ ٹورنٹو میں میرے قیام کا پروگرام پہلے ہی سے دو ہفتے سے زائد طے تھا ------- البتہ ایک دوسری چیز جس کا ذکر بار بار سننے میں آ رہا تھا کسی قدر تشویش کی موجب بن رہی تھی اور وہ یہ کہ حلقۂ احباب کے اکثر ارکان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق بہت سخت مزاج بلکہ بدتمیز قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں یہ تو بالکل ہی پسند نہیں ہے کہ کوئی ان کے والد سے ملاقات کے لیے آئے' فون پر بھی ان کا انداز بہت روکھا پھیکا بلکہ درشت اور خشونت آمیز ہوتا ہے ------- خود مجھے مولانا کے صاحبزادگان اور ان کے مزاج سے قطعاً کوئی واقفیت نہ تھی۔ جماعت اسلامی کے مرکز واقع ۵؍ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں جہاں مولانا بھی اپنے اہل و عیال سمیت مقیم تھے میری آمد و رفت زیادہ تر ۵۱ء سے ۵۴ء تک رہی تھی اور اُس وقت تک مولانا کے تمام صاحبزادے بہت چھوٹے تھے' چنانچہ مَیں ان میں سے نام بھی صرف سب سے بڑے کا جانتا تھا یعنی سید عمر فاروق مودودی کا۔ ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کا نام پہلی بار اُس وقت

_____(۱) جماعت اسلامی کے وابستگان اور متاثرین نے نہ معلوم کن مصلحتوں کی بنا پر امریکہ میں اپنے آپ کو جماعت کے نام سے منظم کرنے کی بجائے ''حلقۂ احبابِ اسلامی'' کے نام سے صرف ایک ڈھیلے ڈھالے حلقۂ احباب کی صورت دے رکھی ہے!

سننے اور پڑھنے میں آیا تھا جب مولانا چند سال قبل بغرضِ علاج لندن اور امریکہ گئے تھے۔ باقی ان سے کوئی اور واقفیت قطعاً نہ تھی ------- بہرحال اس قسم کی باتوں سے دل ڈوبتا سا محسوس ہوا کہ اگر ''حلقۂ احبابِ اسلامی'' کے ارکان کے ساتھ مولانا کے صاحبزادے کا رویہ یہ ہے تو ''تابہ من چہ می رسد؟'' ------- تاہم ارادہ بہرحال یہی رہا کہ ''ہرچہ بادا باد!'' ملاقات کی کوشش ضرور کروں گا۔

اسی اثناء میں ایک روز مَیں ٹورنٹو کی بو سٹیڈروڈ کی جامع مسجد میں بعد نماز مغرب قرآن مجید کا درس دے رہا تھا کہ ایک صاحب نے ایک رقعہ تھمایا جس میں تحریر تھا کہ مولانا مودودی پر عارضۂ قلب کا حملہ ہوا ہے' ان کے لیے دعائے صحت کرا دیجیے! اس خبر سے خود میرے اعصاب پر شدید صدمے کا حملہ ہوا اور میں چند لحظے تو گم سم اور بھونچکا سا رہا۔ بعد میں اپنے حواس کو مجتمع کر کے مَیں نے حاضرین کو اس کی اطلاع بھی دی اور اجتماعی دعا بھی کی -- ----- تاہم پہلی بار مجھے کچھ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے منزل عین نگاہوں کے سامنے آنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہو اور میرے ساتھ ''تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ'' والا معاملہ ہو رہا ہو۔

قیامِ ٹورنٹو کے دن پورے ہو گئے لیکن بفلو سے ملاقات کی اجازت موصول نہ ہوئی تو دل ڈوبنے سا لگا' لیکن دفعۃً پھر اُمید کی ایک کرن نمودار ہوئی' اس لیے کہ ٹورنٹو میں میرے میزبان سمیع اللہ خان صاحب نے مانٹریال کے بعض احباب کے اصرار کی بنا پر وہاں کے سفر کا پروگرام بنا لیا۔ یہ سفر کار کے ذریعے ہوا اور اس میں تین دن صَرف ہو گئے ------- واپس آئے تو تازہ ترین اطلاع یہ ملی کہ اب مولانا کی طبیعت بہت حد تک بحال ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ دو تین روز کے بعد ملاقات کی اجازت مل جائے گی ------- ادھر بعض احباب کی تحریک پر میری ایک وِزٹ (visit) شکاگو کی طے ہو گئی تھی اور ریز رویشن اس طرح ہوئی تھی کہ ٹورنٹو سے شکاگو جانا ہو گا اور وہاں سے براہِ راست نیویارک جہاں سے واپسی کا سفر شروع ہو جانا تھا۔ میری خواہش پر احباب نے پورا پروگرام تبدیل کیا اور اب طے پایا کہ مَیں شکاگو میں دو تین دن قیام کر کے واپس ٹورنٹو

آئوں اور یہاں سے بفلو جا کر احباب کی معیت میں مولانا سے ملاقات کروں اور پھر ٹورنٹو سے نیویارک روانہ ہوں۔

ٹورنٹو کے احباب کے میری خوشنودی کی خاطر اتنے اہتمام پر (جس پر یقیناً پیسے کا صَرف بھی بڑھ رہا تھا) ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جمعہ ۲۱ ستمبر کی سہ پہر کو مَیں شکاگو روانہ ہوا۔ شکاگو کا ذکر تو اس سے قبل بہت سننے

پڑھنے میں آیا تھا' اور اکثر و بیشتر کسی اچھی بات کے ضمن میں نہیں بلکہ کسی نہ کسی برائی ہی کے سلسلہ میں آیا تھا' تاہم وہاں کسی سے کوئی ذاتی شناسائی نہ تھی۔ ٹورنٹو میں جو احباب میرے درس میں تسلسل اور پابندی کے ساتھ شریک رہے تھے ان میں سے ایک صاحب نے خود ہی خفیہ خفیہ اپنے ایک عزیز ڈاکٹر خورشید احمد ملک صاحب کو میری آمد کی اطلاع دے کر ان سے ''دعوت'' منگوالی تھی اور اب میں صرف ان کے نام کی واقفیت کے ساتھ شکاگو جا رہا تھا - ------ شکاگو کے ''اوہیئر'' ائیرپورٹ پر جو صاحب لینے آئے وہ ڈاکٹر خورشید ملک نہیں بلکہ ڈاکٹر وصی اللہ خان تھے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خورشید چونکہ خود کسی آپریشن کے سلسلے میں مصروف تھے' لہٰذا انہوں نے انہیں میرے استقبال پر مامور کیا ہے۔ جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ یہ وہی ڈاکٹر وصی اللہ ہیں جن کا ذکر لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے ضمن میں جماعت و جمعیت کے حلقوں میں سننے میں آتا رہا تھا ------- بلکہ مزید انکشاف یہ بھی ہوا کہ ہم آپس میں دور نزدیک کی قرابت بھی رکھتے ہیں ------- یعنی ان کی والدہ صاحبہ اور میری والدہ ماجدہ دونوں ایک ہی خاندان سے ہیں۔

بہرحال ڈاکٹر وصی اللہ خان نے مجھے تیس چالیس میل کا سفر اپنی کار پر طے کرا کے ڈاکٹر خورشید صاحب کے مکان واقع ڈائونرز گروپر پہنچایا۔ اور مجھے وہاں ڈراپ کر کے وہ خود بھی فوراً اپنی کسی مصروفیت کا عذر کر کے روانہ ہو گئے ------- اب مَیں تھا اور ایک خالص اجنبی ماحول' لیکن جلد ہی یہ سارے حجابات دور ہو گئے۔ ڈاکٹر خورشید صاحب کی والدہ صاحبہ نے جس شفقت و محبّت کا اظہار کیا اور ان کے وجود کے روئیں روئیں سے جس سادگی اور اخلاص کی مہک آئی اس نے فوراً ہی ایسے محسوس کرا دیا کہ گویا میں اپنے ہی گھر میں اپنی

ہی حقیقی والدہ کے زیر سایہ ہوں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر خورشید صاحب بھی آ گئے تو اندازہ ہوا کہ ''اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ'' کے حق ہونے میں تو غالباً سب ہی کو اتفاق ہے لیکن یہاں اصل معاملہ ''اَلوَلَدُ سِرٌّ لِوَالِدَتِہٖ'' کا ہے' ------- نہایت کھلے مزاج کے حامل اور خلوص و اخلاص کے پیکر کامل ! ------- مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہ تھا کہ آئندہ میرے سالانہ سفر امریکہ کا اصل باعث اسی شخص کو بننا ہے اور امریکہ سے کل کا کل تعلق ان ہی کے واسطے سے ہو گا۔

بعد نمازِ مغرب اُن کے مکان پر درسِ قرآن کی نشست ہوئی جس کے کُل شرکاء نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ------- اور اکثر طب کے پیشے سے متعلق تھے۔ اگلے روز یعنی ہفتہ ۲۲ ستمبر کی صبح کو ڈاکٹر صاحب تو پھر اپنی معالجاتی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے گھر سے نکل گئے۔ مجھے ایسے ہی خیال آیا کہ صدر ایوب خان مرحوم کے دور کی ایک ''بدنام'' علمی شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے بارے میں سنا تھا کہ شکاگو میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر خورشید صاحب کے اہلِ خانہ سے ان کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ قیام تو ان کا زیادہ دور نہیں ہے (یعنی یہی کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر ہے !) لیکن وہ کسی سے کم ہی ملتے جلتے ہیں لہٰذا ملاقات آسان نہیں ہے ------- مَیں نے تو کلاً علی

اللہ ان کو فون کر دیا تو حیرت ہوئی کہ وہ فوراً ہی خود آنے کے لیے تیار ہو گئے اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر کرتے پاجامے ہی میں تشریف لائے۔ مَیں ان کے بعض نظریات سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی سادگی اور علمی خلوص کا پہلے سے معترف تھا اور ۱۹۶۸ء میں جو ہنگامہ ان کے خلاف پاکستان کے مذہبی حلقوں کی جانب سے ہوا تھا اس میں مَیں نے ان کی جانب سے کچھ تھوڑی سی ''مدافعت'' بھی کی تھی (جس پر مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے مجھے اپنے مجلے ''المنبر'' میں ''ڈاکٹر فضل الرحمن کے نئے وکیل: ڈاکٹر اسرار احمد'' کے خطاب سے نوازا تھا!) غالباً اسی کا اثر تھا کہ کامل گوشہ گیری اور ملنے جلنے سے احتراز کے باوجود ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لیے اس طرح بلا تامل و تکلّف چلے آئے۔

بہرحال ابھی ان سے گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر خورشید صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ مولانا مودودی کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے معاً

یہ خیال آیا کہ ٹورنٹو میں مولانا کی طبیعت کی بحالی کی جو خبر ملی تھی وہ دراصل ان کا آخری ''سنبھالا'' تھا جیسے بجھنے والا چراغ آخری بار ذرا دیر کے لیے بھڑک اٹھتا ہے ------- میرے اعصاب پر اس خبر سے بجلی سی گری اور میں گم سم سا ہو گیا۔ ڈاکٹر خورشید نے میرے احساسات اور جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً سوال کر دیا ''کیا آپ مولانا کے جنازے میں شرکت کرنا چاہیں گے؟''جس پر میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے ''کیا یہ ممکن ہے؟'' -- ----- اس کا کوئی جواب تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے نہ دیا البتہ فوراً ٹیلی فون کی جانب متوجہ ہو گئے اور چند ہی منٹوں میں مژدہ سنایا: ''فوراً تیار ہو جائیں! حلقۂ احبابِ اسلامی کا ایک قافلہ فی الفور بفلو کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور آپ کے لیے بھی ان کے ساتھ ہی بکنگ ہو گئی ہے۔'' چنانچہ نہایت عجلت میں ائیرپورٹ کے لیے روانگی ہوئی اور ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب بھی اسی کرتے پاجامے میں میرے ساتھ ائیرپورٹ تک گئے (حالانکہ امریکی تہذیب کے اعتبار سے یہ بہت گری ہوئی حرکت ہے۔ وہاں صرف ایک نیکر اور بنیان پہن کر تو انسان پورا ''ملبّس'' شمار ہوتا ہے' لیکن کرتے پاجامے والا انسان ''ننگا'' قرار پاتا ہے!) راستے میں وہ مولانا کے ساتھ اپنی جوانی کے دور کے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے رہے اور نظریات میں شدید اختلافات کے باوجود مولانا کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے رہے۔

ائیرپورٹ پر آٹھ دس حضرات کا قافلہ موجود تھا جن میں سے کسی سے کوئی ذاتی تعارف نہ تھا' صرف بعض حضرات رات کے درس میں شریک رہے تھے ------- البتہ اچانک برادرم ظفر الحق انصاری نظر آئے تو محسوس ہوا کہ یہ شعر عام حالات میں تو شاید مبالغے ہی پر مبنی نظر آئے گا لیکن ''دیارِ غیر'' کی حد تک بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ ؎ ''اے دوست! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا۔ بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا ؑ و خضر ؑ سے!'' -------بہرحال بفلو ائیرپورٹ سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ راستہ وغیرہ کسی کو معلوم نہیں۔ فون پر ڈاکٹر احمد فاروق سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ

ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ نماز جنازہ ہو چکی ہے اور ''فیونرل ہوم'' (Funeral Home) والے مولانا کی میت کو لینے

کے لیے بس آنے ہی والے ہیں۔ اس اطلاع سے سب پر سراسیمگی سی طاری ہو گئی۔ کیا بفلو پہنچنے کے باوجود نہ مولانا کی نماز جنازہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو گی' نہ ان کا منہ دیکھنا ہی نصیب ہو گا؟ ------- لیکن ڈاکٹر احمد فاروق صاحب کے گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ الحمدللہ ابھی مولانا کی میت وہیں موجود ہے ------- حالانکہ ہمیں گھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے میں خاصی تاخیر بھی ہو گئی تھی۔

میرے دل کی اُس وقت جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایک جانب شدید رنج و صدمہ اور خاص طور پر یہ حسرت کہ مولانا سے ان کی زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی اور جو خواہش اس قدر اچانک اور اتنی شدّت سے پیدا ہوئی تھی وہ تشنۂ تکمیل رہ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا !

دوسری جانب خود مولانا کے بارے میں یہ حسرت آمیز احساس کہ ''مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور !'' -- ----- یہاں امریکہ میں کتنے لوگوں کو احساس ہو گا کہ آج کون دنیا سے اُٹھ گیا۔ یہ حادثہ اگر لاہور میں پیش آیا ہوتا تو جو کہرام پورے شہر میں مچا ہوتا اسے چشمِ تصوّر کے سامنے رکھتے ہوئے جب میں نے ڈاکٹر احمد فاروق کے مکان پر جمع گنتی کے چند اشخاص کو دیکھا تو دل میں درد کی ایک شدید ٹیس محسوس ہوئی۔ تیسری جانب خود اپنے بارے میں ایک انجانا سا خوف تھا کہ نا معلوم یہاں میرا استقبال کس طرح ہو۔ ذہناً میں اس کے لیے بھی پوری طرح تیار ہو کر گیا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق نہایت درشتی کے ساتھ کہہ دیں کہ ''آپ اب یہاں کیا لینے آئے ہیں؟ گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں !'' اور یوں مَیں باہر ہی سے بصد حسرت و یاس لوٹا دیا جاؤں !

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر احمد فاروق نے میرا استقبال نہایت شریفانہ و مہذبانہ انداز ہی میں نہیں حد درجہ ادب و احترام کے ساتھ کیا اور چھوٹتے ہی یہ الفاظ کہے:

''مَیں نے آپ کا سلام ابّا جان کو پہنچا دیا تھا ------- اور یہ بھی کہ آپ

ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ ادھر ابّا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن ڈاکٹروں نے شدید پابندی لگائی ہوئی تھی کہ نہایت قریبی اعزّہ کے سوا اور کوئی ملاقات نہ کرے!''

میرے حواس نیم گم سم تو پہلے ہی سے تھے' ڈاکٹر احمد فاروق کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں بالکل ہی گم سم ہو کر رہ گیا' جس پر خود انہوں نے مجھے مکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ایک بنچ پر مولانا کا جسدِ خاکی سفید براق کفن میں لپٹا رکھا تھا۔ بصد حسرت و یاس اُن کا دیدار کیا اور پھر نمازِ جنازہ کے لیے صف درست کی' سب لوگوں نے با صرار مجھے ہی امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ جو لوگ اس سے قبل نماز ادا کر چکے تھے وہ بھی دوبارہ شریک ہو گئے لیکن اس پر بھی کل تعداد پندرہ بیس کی ہو گی۔ (اُس وقت جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ اس سے قبل صرف ایک بار نمازِ جنازہ ہوئی ہے۔ بعد میں روزنامہ جسارت' کراچی میں شائع شدہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل دوبار نماز جنازہ ادا کی جا چکی تھی اور میری امامت میں جو نماز ہوئی وہ تیسری تھی۔ واللہ اعلم!) ------ نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ شور مچ گیا کہ فیونرل ہوم والے آ گئے ہیں اور جلدی کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ امریکی قانون کے مطابق میت گھر پر لانے کی اجازت ہی نہیں ہوتی' ہسپتال سے لاش سیدھی فیونرل ہوم یعنی ''جنازہ گاہ'' جاتی ہے اور وہیں غسل اور تجہیز و تکفین ہوتی ہے اور جملہ رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ تو چونکہ احمد فاروق خود ڈاکٹر تھے۔ اور ایک عرصے سے بفلو میں مقیم ہونے کے باعث کافی با اثر بھی تھے' لہٰذا مولانا کی میت گھر پر آسکی اور تجہیز و تکفین کے مراحل مولانا کی اہلیہ صاحبہ کی نگرانی میں پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ طے پا سکے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ ''فیونرل ہوم'' والوں کو کسی سبب سے دیر ہو گئی تھی' تب ہی ہم مولانا کی زیارت بھی کر سکے اور نماز جنازہ بھی ادا کر سکے' وگرنہ اگر وہ اپنے متعین وقت پر آجاتے تو ہم ان سعادتوں سے بھی محروم ہی رہتے -------(جیسے کہ ڈاکٹر انیس احمد برادر خورد پروفیسر خورشید احمد محروم رہے' اس لیے کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پہنچے جب مولانا کی میت روانہ

ہو چکی تھی) ------- بہرحال ڈرائنگ روم سے باہر فیونرل ہوم کی گاڑی تک لانے میں جو مختصر فاصلہ طے ہوا اس میں مولانا کی میت کو کندھا دینے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی۔

اس موقع پر دو باتیں بہت اچھی مشاہدے میں آئیں: ایک یہ کہ ڈاکٹر احمد فاروق لوگوں کو مولانا کی تصویر اتارنے سے شدّت سے روک رہے تھے' بلکہ ایک موقع پر ذرا سی دیر کو وہ اندر گئے تو ایک نوجوان نے جلدی سے اپنے کیمرے کا بٹن دبا دیا اور تصویر اتار لی۔ لیکن ڈاکٹر احمد فاروق واپس آئے تو انہیں کسی طرح اس کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے با صرار اُن صاحب کے کیمرے سے فلم نکلوالی اور یہ الفاظ کہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ ان تصویروں کا کیا کریں گے!'' اس سے مجھے کسی قدر اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق کی مبینہ سخت مزاجی بلکہ ''بد تمیزی''

لی اصل حقیقت کیا ہے ! ------- دوسرے اس بحث کے ضمن میں کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو مولانا کی اہلیہ صاحبہ لی یہ رائے سامنے آئی کہ ہماری تو خواہش ہے کہ مولانا کی تدفین مدینہ منورہ میں جنّت البقیع میں ہو ------- لیکن اس ضمن میں آخری فیصلہ میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی کا ہو گا اور اگر وہ ہماری رائے سے اتفاق کریں تو سعودی عرب کی حکومت سے اس ضمن میں گفت و شنید بھی وہ خود ہی کریں !''

اسی رات کی آخری فلائٹ سے جب ہم لوگ بھاری سے دل اور خالی سے ہاتھ لیے بفلو سے واپس شکاگو جا رہے تھے تو جو کیفیات ہم سب پر طاری تھیں ان کا اندازہ ہر شخص بخوبی لگا سکتا ہے۔ ان کیفیات کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک تو یہ سوال بار بار آ رہا تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو گی؟ ------- یہ تو مجھے یقین تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان مولانا کی میت کو لازماً پاکستان ہی لے کر جائے گی۔ پاکستان میں میرا گمان تھا کہ اولاً تو کراچی کے احباب شدّت کے ساتھ چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین وہیں ہو۔ پورے پاکستان میں جماعت اسلامی کی مضبوط ترین تنظیم بھی کراچی ہی میں ہے اور اس کا سب سے زیادہ گہرا سیاسی اثر و رسوخ بھی وہیں ہے۔ کتنی ہی بار کراچی والوں نے چاہا تھا کہ جماعت کا مرکز کراچی منتقل ہو جائے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ میرا گمان تھا کہ اب آخری

بار جماعت کراچی کی جانب سے ضرور کوشش ہو گی کہ مولانا کی آخری آرام گاہ تو وہاں بن ہی جائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ ایسا ہو نہیں سکے گا اور میت لا محالہ لاہور جائے گی۔ اور وہاں کے حالات کے بارے میں اِدھر اُدھر سے جو معلومات وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی رہی تھیں اُن کی بنا پر اندیشہ تھا کہ مولانا کے پس ماندگان اور جماعت اسلامی کی قیادت کے مابین لازماً رسہ کشی ہو گی۔ جماعت کے ذمہ دار حضرات چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین ''منصورہ'' میں ہو اور یہ مولانا کے صاحبزادوں کو کسی طور گوارا نہ ہو گا۔ بالآخر ہو گا کیا؟ اس کا جواب تو میرے پاس نہ تھا' البتہ دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ یا تو مولانا کی تدفین مولانا احمد علی رحمہ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کے عام قبرستان میں ہو ----- یا اگر کوئی نمایاں جگہ مطلوب ہی ہو تو کاش کہ مولانا کو بادشاہی مسجد کے سامنے علّامہ اقبال مرحوم کے پہلو میں جگہ مل جائے۔ اس میں جہاں ان دونوں زعماء کی فکری اور نظریاتی ہم آہنگی پیش نظر تھی وہاں یہ واقعہ بھی مدّنظر تھا کہ مولانا کو حیدر آباد دکن سے جانب پنجاب ہجرت کی دعوت دینے والے علامہ اقبال مرحوم ہی تھے ! !

میرے ذہن کی یہ ساری اُدھیڑ بن اپنی جگہ پر' لیکن چند روز بعد نیویارک میں مولانا محمد ناظم ندوی مدّظلہٗ سے اور پھر لاہور واپسی پر اخبارات وغیرہ کے ذریعے جو حالات معلوم ہوئے ان کا واقعہ یہ ہے کہ کوئی سان گمان بھی مجھے اُس وقت نہ تھا۔ نیویارک اور لندن کے ہوائی اڈوں پر ڈاکٹر احمد فاروق اور پروفیسر خورشید صاحب کے مابین تلخ کلامی' جماعت کی جانب سے کراچی کے کسی الیکشن کے پیش نظر میت کے پاکستان پہنچنے کے پروگرام میں تاخیر کی

کوشش پر ڈاکٹر احمد فاروق کا غصّہ اور پیچ و تاب' پھر لاہور میں تدفین کی جگہ کے فیصلے پر جماعت اسلامی کی قیادت اور مولانا کے پس ماندگان کے مابین شدید کشمکش بلکہ محاذ آرائی اور باہمی تو تکار تک نوبت' اور بالآخر مولانا محمد یوسف (امیر جماعت اسلامی ہند) کی کوششوں سے تصفیہ ------- اور تدفین کے بعد مولانا کے چھ صاحبزادوں کی مشترکہ پریس کانفرنس جس میں انہوں نے جماعت اسلامی کے ذمہ دار لوگوں پر شدید الزامات عائد کیے وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی

مجھے اُس وقت نہ تھا۔

بفلو سے شکاگو واپسی کے سفر میں میٹرک کے زمانے میں پڑھی ہوئی ایک انگریزی نظم ''نغمۂ زندگی'' (A Psalm of Life by Henry Wadsworth Longfellow) میری یاد داشت کے زیریں حصے سے رفتہ رفتہ اُبھر کر ذہن کی سطح پر تیرنے لگی۔ میں اس نظم کا ایک بند سورۃ العصر کے درس میں لفظ ''عصر'' کی تشریح کے ضمن میں اردو کے اس شعر کے ساتھ ساتھ کہ ؎

''غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی

گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی !''

پڑھا کرتا تھا۔ یعنی

,Art is long, and Time is fleeting

,And our Hearts, though stout and brave

Still, like muffled drums are beating

.Funeral marches to the grave

لہذا اس نظم کا یہ بند تو مجھے یاد تھا لیکن باقی نظم قطعاً یاد نہ تھی۔ اور بعض مواقع پر مَیں نے حافظے پر زور دے کر یاد کرنا چاہا تو بھی یاد نہ کر سکا تھا۔ لیکن اُس وقت جو کیفیت قلب و ذہن پر طاری تھی اس کے زیر اثر وہ پوری نظم از خود میری یادداشت کی گہرائیوں سے اُبھر آئی اور پورے سفر کے دوران میرے ذہن پر چھائی رہی !

,Tell me not, in mournful numbers

"" ! Life is but an empty dream "

,For the soul is dead that slumbers

.And things are not what they seem

! Life is real ! Life is earnest

;And the grave is not its goal

",Dust thou art, to dust returnest "

.Was not spoken of the soul

اس کے بعد وہ بند ہے جو اوپر نقل ہوا ... اور پھر:

Lives of great men all remind us

,We can make our lives sublime

And, departing, leave behind us

;Footprints on the sands of time

,Footprints, that perhaps another

,Sailing over life's solemn main

,A forlorn and shipwrecked brother

.Seeing, shall take heart again

,Let us, then, be up and doing

;With a heart for any fate

Still achieving, still pursuing

.Learn to labour and to wait

الغرض ان احساسات اور کیفیات کے ساتھ بفلو سے شکاگو واپسی ہوئی۔ وہاں ۲۳ء اور ۲۴ء کے دو دنوں کے دوران کچھ مفصل ملاقاتوں اور کچھ درسِ قرآن کی محفلوں کے بعد ۲۵ کو ٹورنٹو واپس آنا ہوا۔ اگرچہ اب اس مراجعت ِٹورنٹو کا اصل مقصد فوت ہوچکا تھا۔ تاہم چونکہ پروگرام اسی طرح بنا تھا اور میرا سامان وہیں رکھا تھا' لہٰذا وہاں جانا ضروری تھا۔ وہاں سے ۲۷ کو نیویارک واپسی ہوئی جہاں مولانا یوسف اصلاحی (رام پور' انڈیا) کی زبانی معلوم ہوا کہ شدید ردّ و قدح اور تلخی و محاذ آرائی کے بعد بالآخر مولانا کی تدفین اُن کے مکان واقع ۵۔ اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور ہی کے بیرونی پلاٹ میں ہوئی جہاں وہ کم و بیش تیس سال تک عصر اور مغرب کی نمازیں با جماعت ادا کرتے رہے تھے-----اس پر ایک عجیب ساخیال ذہن میں آیا کہ اچھرہ بھی عجیب بستی ہے' اس میں مین فیروز پور روڈ کی ایک جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر علّامہ عنایت اللہ مشرقی مدفون ہیں جتنے فاصلہ پر سڑک کی دوسری جانب اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قبر ہے۔ اور ذرا آگے چلیے تو سڑک کی ایک جانب شاہ جمالؒ کا مزار ہے تو دوسری جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر شاہ کمالؒ کا ------ اگلے روز مولانا محمد ناظم ندوی مدّظلہٗ سے ملاقات کے دوران وہ

حالات و واقعات علم میں آئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تو مَیں نے خود اپنے آپ میں ایک ندامت سی محسوس کی' نہ معلوم کیوں!

نومبر کے پہلے ہفتے میں لاہور واپس پہنچ کر فوری اور ضروری امور سے فراغت کے فوراً بعد پہلی فرصت میں ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ حاضری ہوئی۔ ڈاکٹر احمد فاروق واپس امریکہ جا چکے تھے۔ مولانا مرحوم کے باقی پانچ صاحبزادوں سے اجتماعی ملاقات ہوئی' جو بحمد ِاللہ ہرگز رسمی نہ تھی۔ نمازِ مغرب کا وقت آیا تو سب نے با صرار مجھے ہی آگے بڑھایا۔ یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ مولانا کی قبر نہایت سادہ تھی اور اس کی نہ تو سطح ہی زمین سے زیادہ بلند تھی نہ ہی کسی اور تکلف یا تصنع کے کوئی آثار تھے ------ بہرحال مرقد ِسیّد پر سلام و دُعا کے ساتھ دل ہی دل میں یہ شعر پڑھتے ہوئے واپسی ہوئی ؎

''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے!''

مولانا مودودی مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی نے بفلو میں جس انداز میں میرا استقبال کیا تھا اس کے ضمن میں احسان مندی کا گہرا نقش میرے دل پر قائم تھا اور خیال یہ تھا کہ لاہور میں ان سے ملاقات ہو گی تو ان کے شکریے کا جو قرض میرے ذمہ واجب الادا ہے ان کی خدمت میں پیش کردوں گا ------ مزید برآں انہوں نے جو یہ الفاظ کہے تھے کہ ''ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے!'' تو اُس وقت تو رنج و غم کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں قلبی مسرّت کی ایک بجلی سی ان کے ذریعے کوند گئی تھی لیکن بعد میں ان کے ضمن میں یہ احساس رہا کہ ''آنچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب؟'' لہٰذا ان کی بھی توثیق کی خواہش دل میں تھی' چنانچہ اگلے سال جب پھر امریکہ اور کینیڈا کا سفر ہوا تو ۳ ستمبر ۱۹۸۰ء کو میں ٹورنٹو کے دوا حباب سمیع اللہ خاں اور محمد نجم طاہر کی معیت میں بفلو حاضر ہوا۔ اور میری حیرانی اور احسان مندی میں مزید اضافہ ہوا

کہ اس بار میرا استقبال اور بھی زیادہ گرم جوشی سے ہوا۔ دن کا کھانا بھی مَیں نے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی ہی کے ساتھ کھایا جنہوں نے میری خاطر ہسپتال سے نصف یوم کی رخصت لے لی تھی۔ اس موقع پر ایک تو مَیں نے ان کا تہ دِل سے شکریہ ادا کیا اور صاف بتا دیا کہ ''مَیں تو گزشتہ سال ذہناً اس کے لیے بھی تیار ہو کر آیا تھا کہ آپ مجھے گھر میں داخل ہونے سے روک دیں' لیکن جو پذیرائی آپ نے میری اس موقع پر کی اس کے لیے حسب فرمانِ نبوی ﷺ ''مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہ!'' جو شکریہ میرے ذمے تھا اُس وقت تو مَیں اسے شدّتِ جذبات سے مغلوبیت کے باعث ادا نہ کر سکا تھا' اب یہ پورا سفر اسی قرض کی ادائیگی کے لیے کیا ہے ------ ثانیاً مَیں نے احبابِ ٹورنٹو کی موجودگی میں اُن سے ان متذکرہ بالا الفاظ کی توثیق حاصل کی جو اَب میرے لیے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔

ثانیاً تحریک اسلامی اور اس کے مستقبل کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ مولانا کے صاحبزادگان میں سے کم از کم ڈاکٹر احمد فاروق بھرپور تحریکی مزاج کے حامل ہیں۔ لیکن بعض طالع آزما لیڈروں نے جو معاملہ ان کے ساتھ کیا اور اوّلاً اُن کے قیامِ کراچی اور وابستگیٔ جمعیت کے دوران اور پھر امریکہ میں اُن کی کردار کشی کی جو مہم چلائی اس نے ان کے مزاج میں زہر کی تلخی بھی گھول دی ہے اور مایوسی کی تاریکی بھی!!------ ورنہ وہ اعلیٰ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی فہم' تحریکی شعور اور پابندیٔ صوم و صلوٰۃ ہر اعتبار سے نہایت قیمتی آدمی ہیں۔ مَیں نے ہر چند انہیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ پاکستان مراجعت اختیار کریں اور اپنے والد مرحوم کے مشن کو خود اپنے فہم و شعور کے مطابق جاری رکھنے کے لیے اپنے دوسرے بھائیوں کے تعاون سے آگے قدم بڑھائیں' لیکن محسوس یہی ہوا کہ انہیں بعض مشہور و معروف حضرات سے بالکل آمنے سامنے کے تصادم (confrontation) کا شدید اندیشہ ہے جس کے باعث وہ عافیت پاکستان سے دور رہنے ہی میں محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ اس روز اُن سے سننے میں

آیا اس کو جوں کا توں نقل کرنا نہ تا حال زبان کے لیے ممکن ہے نہ قلم کے لیے ------ گویا ع ''مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!'' والا معاملہ ہے۔ تاہم اس قدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

اگرچہ مَیں جماعت اسلامی کے ناقدین میں غالباً اب (بعض دوسرے بزرگوں کی مصلحت آمیز خاموشی کے باعث) سرفہرست ہوں اور اُس کوچے کا بدنام ترین فرد سمجھا جاتا ہوں ،لیکن بایں رسوائی و بدنامی ان باتوں کے عُشرعشیر کا علم تو درکنار سان گمان تک نہیں رکھتا تھا جو اُس روز ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے ذریعے میرے علم میں آئیں ---- -- اور جن کا ماحصل علّامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ ؎

''خداوندا یہ تیرے سادہ دِل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری!''

------ ویسے حال ہی میں جو مقدّمہ بازی جماعت اسلامی کے متعدد مرکزی رہنمائوں اور مولانا مرحوم کے چوتھے صاحبزادے حسین فاروق مودودی کے مابین شروع ہوئی ہے اور جس نوع کے بیانات مولانا کے پانچویں صاحبزادے حیدر فاروق مودودی کی جانب سے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت اب زیادہ دور نہیں کہ ع

''سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا!''

میرے لیے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کی ملاقات اور گفتگو سے حاصل شدہ معلومات کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ان جملہ اطلاعات کی توثیق ہو گئی جو مجھ تک اِدھر اُدھر سے پہنچتی رہی تھیں اور جن کے باعث دل میں شدید تمنّا پیدا ہوئی تھی کہ امریکہ میں مولانا سے ملاقات کی جائے۔ (ان کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا!)

بہرحال ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے جو ذہنی و قلبی رابطہ ان دو ملاقاتوں کے ذریعے استوار ہوا تھا اس کی مزید تقویت اور آبیاری کے لیے مَیں نے اگلے سال یعنی ۱۹۸۱ء میں امریکہ کے تیسرے سفر کے موقع پر ملاقات کی سبیل اس طرح نکالی کہ ادھر انہیں بھی دعوت دی کہ وہ نیاگرا آجائیں اور ادھر ٹورنٹو سے میں خود بھی عزیزم عاکف سعید سلّمہ�ٗ اور دو احباب یعنی ڈاکٹر نسیم اللہ اور جناب بیگ صاحب کی معیت میں منگلوار ۱۶ ؍جون کو نیاگرا پہنچ گیا' جہاں ان سے کئی گھنٹے کی ملاقات اور گفتگو رہی۔

باب دوم

مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرے

تعلق کا ابتدائی دور

(شائع شدہ ''میثاق'' اکتوبر ۱۹۸۲ء)

مولانا مودودی مرحوم و مغفور سے میرے تعارف کی ابتدا جیسا کہ مَیں اس سے قبل بھی بعض مواقع پر عرض کر چکا ہوں' ۴۶۔ ۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی جبکہ میں حصار (مشرقی پنجاب' حال ہریانہ' بھارت) میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اُس وقت میرے شعور یا نیم شعور' جو بھی اسے قرار دیا جائے' پر اصل تسلّط تو علّامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری اور مسلم لیگ کی قومی تحریک کا تھا۔ چنانچہ عملاً مَیں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے وابستہ تھا' لیکن کچھ ابتدائی کتابچے مولانا مودودی کے بھی میں نے پڑھ لیے تھے اور ان سے ایک گہرا تأثر بھی میرے ذہن نے قبول کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد جو ان دنوں میکلیگن انجینئرنگ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے مولانا مودودی کی تصانیف کا مطالعہ بالاستیعاب کر رہے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران مَیں انہیں اکثر مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے اور خالص طالب علمانہ انداز میں نوٹس تیار کرتے دیکھتا تھا۔ چنانچہ یہی کام کچھ اُن کے ''دیکھا دیکھی'' اور کچھ اپنے ذاتی شوق کے باعث مَیں بھی کرتا تھا ------ اس کا نتیجہ یہ

تھا کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں جب مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو مَیں اُن کی جانب سے مدافعت کی کوشش کیا کرتا تھا' اگرچہ عملاً میری کامل وابستگی فیڈریشن اور لیگ ہی کے ساتھ رہی۔

حصار میں اُن دنوں چوہدری نذیر احمد مرحوم اور مرزا مسرت بیگ مرحوم جماعت اسلامی کے فعال اور سرگرم کارکن تھے۔ میرا ان دونوں ہی حضرات کے یہاں آنا جانا

تھا۔ چوہدری صاحب کے فرزند کلاں ڈاکٹر ظہور احمد سے جو آج کل جہانیاں ضلع ملتان میں مطب کرتے ہیں' میرا کافی گہرا دوستانہ تھا ------ ان ہی دنوں حصار میں جماعت اسلامی نے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کے سلسلے میں کچھ عرصے کے لیے مولانا صدر الدین اصلاحی بھی حصار میں مقیم رہے تھے۔ ان کی بھی اس زمانے کی ایک ہلکی سی جھلک میرے حافظے کے کسی گوشے میں تاحال محفوظ ہے۔

فیڈریشن کی تنظیم کے سلسلے میں میرا ضلع حصار کے دوسرے قصبات خصوصاً سرسہ اور ہانسی بھی جانا آنا رہتا تھا۔ سرسہ میں میرے قریبی اعزّہ کا ایک خاندان آباد تھا۔ یعنی میرے والد مرحوم کے حقیقی ماموں جن کے دو صاحبزادگان ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی جو ''اردو ڈائجسٹ'' کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں' ان کے ایک برادر بزرگ حافظ افروغ حسن اُن دنوں جماعت اسلامی میں باضابطہ بطورِ رکن شامل ہو چکے تھے۔ بنابریں اس گھرانے میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا بہت چرچا تھا۔ اس ناطے میرا ذہنی تعلق مولانا مودودی کے ساتھ مزید گہرا اور پختہ ہوا۔ سرسہ کے قریب ہی جماعت اسلامی کے رفقاء نے ''دار الاسلام'' پٹھانکوٹ کے طرز پر ایک مثالی بستی گویا منی (mini) دار الاسلام قائم کی تھی جس کی روحِ رواں حکیم عبداللہ روڑوی مرحوم و مغفور تھے۔ میرا وہاں بھی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ اور اس کی بعض جھلکیاں بھی میری یادداشت میں تاحال محفوظ ہیں!

۱۹۴۶ء کی تعطیلاتِ موسم گرما کے ایک یادگار سفر کا مختصر ذکر مَیں اس روداد میں کر چکا ہوں جو جنوری 'فروری ۱۹۸۰ء کے میثاق میں شائع ہوئی تھی اور جس کا حوالہ اس تحریر کے آغاز میں بھی آچکا ہے۔ اس کے

دوران، مَیں نے بھائی اظہار صاحب کی معیت میں دو یا تین دن دارالاسلام، پٹھانکوٹ، میں بھی بسر کیے تھے۔ اس کی بھی جو یادیں اب تک حافظے میں محفوظ ہیں ان میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

مولانا امین احسن اصلاحی کا درسِ قرآن نماز فجر کے بعد ہوتا تھا۔ اس میں فضا بالعموم بہت بوجھل ہوتی تھی اور نہ صرف یہ کہ علمی وقار و متانت کا رنگ غالب رہتا تھا بلکہ رعب اور

دبدبے کی کیفیت قائم رہتی تھی۔ جبکہ مولانا مودودی کا جو درسِ حدیث نمازِ ظہر کے بعد ہوتا تھا اس میں ماحول بالعموم شگفتہ رہتا تھا جس میں کبھی کبھی طنز و مزاح کا رنگ بھی شامل ہو جاتا تھا اور بالخصوص جناب عبدالعزیز شرقی اپنے دلچسپ سوالات کے ذریعے اس کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ جن کے جواب میں اکثر ''مولویوں'' کی ''مُوشگافیوں'' پر طنز کا عنصر شامل ہو جاتا تھا۔

البتہ بالمشافہ ملاقات میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی سے ملاقات آسان نہ تھی جبکہ مولانا اصلاحی سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا۔ پھر گفتگو کے دوران بھی مولانا مودودی سے قدرے بُعد اور فاصلے کا احساس طاری رہتا تھا جبکہ مولانا اصلاحی بالکل ''گھل مل'' کر بات کرتے تھے۔ ایک فوری تقابل (simultaneous contrast) کا یہ نقشہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ ہم نے ایک بار مولانا مودودی کے کمرے میں جھانکا تو اسے نہایت آراستہ پیراستہ پایا، فرش پر قالین بھی تھا، میز کرسی بھی ڈھنگ کی تھی اور ملاقاتیوں کے لیے بھی صوفہ موجود تھا۔ مولانا مودودی اُس وقت اپنی گردن گھومنے والی کرسی کی پشت پر ٹکائے، آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ چنانچہ انہیں ہمارے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے کی بالکل خبر نہ ہوئی اور ہم نے بھی مزید مخل ہونا مناسب نہ سمجھا ------ جبکہ مولانا اصلاحی کے کمرے میں ایک نہایت سادہ سی میز تھی اور اسی قسم کی ایک کرسی جس پر مولانا تشریف فرما تھے۔ اور سامنے بھی ایک بوسیدہ سا بینچ تھا جس پر ملاقاتی بیٹھتے تھے۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں بھائی کافی دیر تک بیٹھے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور ہم نے مولانا سے کسی قسم کا بُعد یا فصل محسوس نہیں کیا۔

مولانا اصلاحی کے صاحبزادے ابو صالح مرحوم اور مولانا عبدالجبار غازی مرحوم و مغفور کے صاحبزادے عرفان غازی نے ''دارالاسلام'' میں روزمرّہ کی ضروریات کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے بھی ان سے کچھ چیزیں بالکل ''بلاضرورت'' خریدی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں ہم جن مراحل سے گزرے ان کی تفصیل تو ظاہر ہے کہ اِس وقت نہ ضروری ہے نہ ممکن۔ البتہ ان ایام کا ایک واقعہ میری آئندہ زندگی کے رخ کی تعیین کے اعتبار سے یقیناً بہت اہم ہے ‘اور وہ یہ کہ جب ہم حصار میں ہندوئوں کے حملوں کے باعث ’’محصور‘‘ ہو گئے تو اُن دنوں مَیں اور بھائی جان ایک مسجد میں ’’ترجمان القرآن‘‘ کے پرچوں میں شائع شدہ ’’تفہیم القرآن‘‘ کی اقساط کا مل جل کر مطالعہ کرتے تھے جن میں اُن دنوں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ مَیں نے اُن دنوں تازہ تازہ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس میں سائنس کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی بطور مضمون پڑھی تھی اور کچھ اپنے ذاتی شوق اور زیادہ تر استاذِ محترم مولانا محمد حسن مرحوم و مغفور کی مشفقانہ محنت کے نتیجے میں اس میں خاصی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ ادھر بھائی جان نے بھی اگرچہ میٹرک تو اسی طرح سائنس اور عربی دونوں کے ساتھ ہی کیا تھا لیکن چھ سال گزر جانے کے باعث اُن کا عربی قواعد کا علم پرانا ہو چکا تھا‘ چنانچہ ’’عربی دانی‘‘ میں فی الوقت میرا پلڑا اُن سے بھاری تھا۔ چنانچہ جب کسی معاملے میں بحث کی نوبت آجاتی تھی تو اکثر و بیشتر انہیں میری بات ماننی پڑتی تھی ------ بہرحال اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ میرا قرآن حکیم کے مطالب و معانی سے پہلا تعارف تھا جو سورۂ یوسف کی ’’تفہیم‘‘ کے ذریعے ہوا -- ---- اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ اصلاً سورۂ یوسف کی اپنی چاشنی اور مٹھاس اور پھر ع ’’ذکر اُس پری وَش کا اور پھر بیاں اپنا !‘‘ کے مصداق مولانا مودودی کے اندازِ تعبیر و تفہیم کو میرے قرآن حکیم کے ساتھ آئندہ ربط و تعلق کی استواری میں اہم دخل حاصل ہے جس کے لیے مَیں مولانا مودودی کا تازیست ممنونِ احسان رہوں گا۔

حصار کی ’’محصوری‘‘ کے انڈین آرمی کے ہاتھوں زبردستی خاتمے ------ اور پھر کچھ عرصہ ایک نو تعمیر شدہ جیل میں قائم ’’کیمپ‘‘ میں گزار کر جب ہمارا خاندان آگ اور خون کے دریا عبور کرتے ہوئے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا فاصلہ بیس دنوں میں ایک پیدل قافلے کے ساتھ طے کر کے اپنے خوابوں کی سر زمین ’’پاکستان‘‘ پہنچا

تو بھائی جان نے تو پہلے کچھ عرصہ مہاجرین کے کیمپوں میں جماعت اسلامی کی جانب سے ہونے والے امدادی کام میں صرف کیا اور پھر وہ ایس۔ ڈی۔ او محکمہ انہار کی حیثیت میں اپنی تقرری کا پروانہ لے کر پہلے چیچہ وطنی اور پھر پاکپٹن چلے گئے اور مَیں کرشن نگر لاہور میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں داخل ہو گیا۔

ایف ایس سی کے دو سالوں کے دوران مَیں نے جماعت اسلامی کے کرشن نگر لاہور کے حلقہ ہمدردان میں نہایت تندہی اور سرگرمی سے کام کیا۔ بلکہ یہ کہنا ہرگز مبالغے پر مبنی نہیں ہے کہ اس حلقے کی اصل روحِ رواں میں ہی تھا۔ چنانچہ میں ہی اس کے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کرتا تھا اور اس میں مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر سناتا تھا۔ اور مَیں نے ہی اس کا ایک ''دارالمطالعہ'' قائم کیا تھا جس کا سائن بورڈ بھی خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا۔ کُوالمنڈی میں واقع دفتر ''کوثر'' میں جو ہفتہ وار اجتماعات جماعت اسلامی لاہور کے اُن دنوں ہوتے تھے اُن میں بھی میں پابندی سے شرکت کرتا تھا اور وہاں گاہے بگاہے مولانا مودودی کی زیارت اور ان کے وہ ''تبصرے'' سننے کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی جو وہ مختلف حلقوں کی رپورٹوں پر کرتے تھے ------ ریڈیو پاکستان سے ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے عنوان سے جو پانچ تقریریں مولانا کی اُن دنوں نشر ہوئیں ان کو ہم کرشن نگر کے چوک میں دریاں بچھا کر ایک جلسے کی صورت میں خود سننے اور دوسروں کو سنانے کا اہتمام کرتے تھے۔ اغلباً اپریل ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام پاکستان میں جو پہلا جلسۂ عام موہنی روڈ لاہور پر واقعہ خالصہ ہائی سکول کے میدان میں ہوا تھا اس میں مَیں نے پہلی بار مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مفصّل تقاریر براہ راست سنیں۔ مولانا مودودی کی تقریر کا عنوان تھا ''مطالبہ نظامِ اسلامی'' اور اصلاحی صاحب کی تقریر کا موضوع تھا ''آزادی کے اسلامی تقاضے''۔ اور ان دونوں بزرگوں کی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں کی تقریروں کے دوران میری آنکھوں کے کیمرے کے ذریعے ان کی اُس وقت کی شبیہوں کا جو عکس میرے شعور کی سطح پر مرتسم ہوا تھا وہ میرے ذہن کے ''محافظ خانے''

میں تا حال محفوظ ہے۔ تاہم اُس وقت تک ان دونوں بزرگوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت یہ تھی کہ اپنے اور ان کے مابین محبّت و عقیدت کے انتہائی قرب کے باوصف مقام اور مرتبے کا طویل اور ناقابلِ عبور فاصلہ حائل معلوم ہوتا تھا اور دور سے ان کی زیارت کرتے ہوئے میں بالکل ایسے محسوس کرتا تھا جیسے کسی بلند و بالا فصیل کے دامن میں کھڑا سر اونچا کیے اُس کی کسی بلند برجی کو دیکھ رہا ہوں۔

لیکن جلد ہی یہ فاصلے کم ہونے شروع ہو گئے۔ اس کا ایک سبب تو بالکل فطری اور ریاضیاتی تھا 'یعنی یہ کہ ۱۹۴۷ء میں میری عمر ۱۵ سال تھی اور مولانا مودودی کی ۴۴ سال۔ گویا کہ نسبت ایک اور تین کی تھی۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں مولانا کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور میری ۲۸ برس' گویا نسبت کم ہو کر ایک اور دو کی رہ گئی۔ لیکن دوسرا اور اہم تر سبب یہ ہوا کہ بعض اسباب سے مَیں جماعت اسلامی اور جمعیت طلبہ کے حلقوں میں نمایاں ہو گیا اور اس

طرح ان ''اکابر'' کی نگاہوں میں بھی آگیا۔ اور اس طرح فاصلے کم ہوتے چلے گئے۔

ہوا یوں کہ جیسے ہی میں نے ایف ایس سی پاس کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کلاس میں داخلہ لیا مَیں نے اپنی رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل کر لی اور اس طرح اب میرا رابطہ جماعت اسلامی کی بجائے اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہو گیا۔ اور چونکہ مجھے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کا خاصا عملی تجربہ حاصل تھا' لہٰذا مَیں جمعیت میں ایک دم فعال اور سرگرم ہو گیا اور سالِ اوّل کے دوران ہی مجھے جمعیت لاہور کے حلقہ میڈیکل کالج کا ناظم بھی مقرر کر دیا گیا۔ اور اکثر و بیشتر جمعیت کے اجتماعات میں درسِ قرآن کی ذمہ داری بھی میرے ہی سپرد ہونے لگی۔

اُدھر موسم گرما کی تعطیلات میں مَیں والدین کے پاس منٹگمری (حال ساہیوال) جاتا تھا تو وہاں کی مقامی جماعت کے ساتھ سرگرمی سے کام کرتا تھا اور میرے درسِ قرآن کا کچھ ایسا شہرہ جماعت کے قریبی حلقوں میں ہو گیا تھا کہ وہاں بھی تمام تر کم علمی اور نو عمری کے باوجود درسِ قرآن کی ذمہ داری مجھ ہی پر ڈالی جاتی تھی۔

۱۹۵۰ء میں مولانا مودودی نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کے ضمن میں پورے

صوبے کا تفصیلی اور طوفانی دورہ کیا تو اس کے سلسلے میں منٹگمری میں مَیں نے نہایت تندہی سے کام کیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ روزنامہ ''تسنیم'' کا انتخابات نمبر مَیں نے تانگے پر لائوڈ اسپیکر لگا کر اس میں شائع شدہ پنجابی نظمیں ترنّم سے پڑھتے ہوئے پورے شہر کا چکر لگا کر فروخت کیا تھا ------اور پھر جب مولانا مودودی اس دورے کے سلسلے میں منٹگمری تشریف لانے والے تھے تو میں نے برادرم نبی احمد خاں لودھی (جو اَب حکومت پاکستان کے شعبہ اطلاعات سے متعلق ہیں) کی معیت میں ایک کار پر لائوڈ اسپیکر نصب کر کے منٹگمری سے عارف والہ' وہاں سے پاکپٹن اور پھر وہاں سے واپس منٹگمری کا تقریباً ایک سو میل کا سفر اس شان سے کیا تھا کہ پورے راستے کے دوران سڑک کے قریب کی تمام آبادیوں اور دیہات میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کر کے لوگوں کو مولانا کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی' جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا تھا اور دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ مولانا کی تقریر سننے کے لیے منٹگمری آئے تھے ------ یہ دوسری بات ہے کہ منٹگمری کے آس پاس کے دیہات کے باشندے' بالخصوص وہ جنہیں عرفِ عام میں ''جانگلی'' کہا جاتا ہے' مولانا کی شستہ اردو نہ سمجھ سکے اور مایوس ہو کر لوٹ گئے ------ اس موقع پر مَیں نے مولانا مودودی کو برادرم علی احمد کے تعاون سے منٹگمری کے طلبہ کی جانب سے ایک عصرانہ بھی دیا تھا جس میں ایک باضابطہ ''سپاسنامہ'' بھی مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا' جو لکھا بھی مَیں نے تھا اور پڑھا بھی مَیں نے ہی تھا۔ (اور غالباً جماعت اسلامی کی تاریخ میں ''سپاسناموں'' کی ''بدعت'' کا آغاز اسی سے ہوا تھا جس پر بعد میں مجھے ہمیشہ شرمندگی کا احساس ہوتا رہا!)

اس موقع پر اوکاڑہ میں جو اجتماع جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ہوا تھا اس میں بھی مَیں نے طلبہ کا ایک علیحدہ اجلاس منعقد کرایا تھا جس میں میں نے مولانا کی موجودگی میں اپنی پہلی ارتجالی تقریر کی‘ جس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس کی دل کھول کر تحسین فرمائی اور اس طرح مَیں ذاتی طور پر اُن کی نگاہوں میں آتا چلا گیا۔

239

۱۹۵۱ء میں جب الیکشن بالفعل منعقد ہوئے تو وہ میرے میڈیکل کی تعلیم کے دوران کے مشکل ترین امتحان (یعنی فرسٹ پروفیشنل) کے دن تھے۔ لیکن پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی جو دُھن اُس زمانے میں جماعت اور جمعیت کے ہر رکن اور کارکن پر سوار تھی اس کے زیر اثر مَیں نے بھی رات دن ایک کر کے محنت کی اور اپنی تعلیم اور کیریر کے کسی خیال کو ذہن کے قریب نہ آنے دیا۔ لیکن پھر جب اس میں جماعت کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو کچھ اس کے صدمے کے باعث اور کچھ اس لیے کہ اس کے فوراً بعد رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اور اس کے فوراً بعد امتحان ہوا‘ میری صحت جواب دے گئی۔ اور ابھی امتحان کے تحریری پرچے ہی ہوئے تھے اور پریکٹیکل باقی تھے کہ مجھ پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہوگیا۔ نتیجۃً اس کے باوجود کہ تحریری پرچوں میں مَیں نے پوری کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی‘ مجھے پورا امتحان (ستمبر ۱۹۵۱ء میں) دوبارہ دینا پڑا۔ (اور الحمدللہ کہ یہ میرے پورے تعلیمی کیریر کا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے!)

اواخر ۱۹۵۱ء سے اواخر ۱۹۵۳ء تک‘ دو سال کا عرصہ میرے مولانا مودودی سے انتہائی قرب کا زمانہ ہے‘ جس کے دوران مجھ پر مولانا کی بزرگانہ شفقتیں اور مربیانہ عنایتیں اس حد کو پہنچ گئیں کہ عمر اور مقام و مرتبے کے ’’بُعد المَشرِقَین‘‘ کے علی الرغم بے تکلفی کا عالَم یہ ہو گیا کہ ’’باہمی‘‘ گفتگو میں طنز و مزاح کا استعمال بھی ’’دوطرفہ‘‘ ہونے لگا۔

نومبر ۱۹۵۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو جلسۂ عام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں منعقد ہوا‘ اس میں جو تقریر مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر صدارت کی اُس کا

جمعیت اور جماعت کے حلقوں میں بہت شہرہ ہوا۔ خود مولانا اصلاحی نے اس کی نہایت دل کھول کر تحسین و تعریف کی۔ چنانچہ جماعت کے مرکز کے حلقے میں بھی اس کا بہت چرچا ہوا۔ (یہ تقریر طویل عرصے تک ''ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار'' کے عنوان سے جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا ''جزوِلاینفک'' رہی۔ اور اغلباً اب بھی ہے!)

غالباً یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اواخر دسمبر ۱۹۵۱ء میں جب مَیں نے لاہور میں جمعیت کے زیراہتمام ایک ''تربیت گاہ'' منعقد کی جس میں درس قرآن مولانا اصلاحی نے دیا اور درسِ حدیث مولانا مودودی نے' تو اس کے بالکل آغاز ہی میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ مولانا مودودی کے دل میں میرے لیے شدید محبّت و شفقت موجود ہے اور مَیں اُن کی خصوصی توجّہ اور التفات کا مرکز ہوں۔ میرے لیے اس احساس میں جو سرور اور کیف مضمر تھا اس کا اندازہ ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کے وہ دس دن جو ۲۲ر تا ۳۰ر دسمبر ۱۹۵۱ء ان بزرگوں کی شفقت و عنایت کے سائے میں بسر ہوئے ''حاصلِ زیست'' نہیں تو ایک متاعِ گراں مایہ ضرور ہیں۔ اس لیے کہ ایک تو انہی دنوں کے دوران میرا ''تدبرِ قرآن'' کے فراہی ؒمکتب فکر'' سے ابتدائی تعارف ہوا ------ اور دوسرے ان ہی ایام کے قربِ پیہم کے نتیجے میں مولانا مودودی سے ''بے تکلّفی'' کا آغاز ہوا' اور بُعد و فصل کے سارے حجابات اُٹھتے چلے گئے۔

مولانا مودودی کی جانب سے بے تکلفی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز مَیں نے مولانا سے عرض کیا کہ ''آج آپ ہمیں اپنے کچھ حالاتِ زندگی سنایئے!'' تو مولانا نے بے ساختہ فرمایا ''گویا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا مولود شریف خود پڑھوں!'' جس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

اِدھر اپنی بے تکلفی یا ''کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ'' کے مصداق ''گستاخی'' کی یہ مثال قابلِ ذکر ہے کہ تربیت گاہ کے آخری دن ہم نے جملہ اساتذہ اور مربی حضرات کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا ------ تو جب مَیں نے مولانا مودودی سے اس کا ذکر کیا اور انہیں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا: ''اچھا ------ لیکن پھر مَیں بھی کوئی چیز لے کر آئوں گا!'' ------ اس پر مَیں نے بلا جھجک کہا کہ ''اگر یہ بات ہے تو پھر ہم لوگ مرغی پکا رہے ہیں' آپ بھی کوئی مقابلے کی چیز لے کر آیئے گا!'' اگرچہ مولانا نے ''مجھے اس کا یہ بھرپور'' جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنا دیا کہ ''مرغی کے مقابلے کی چیز تو بلّی ہے!''

نومبر ۱۹۵۱ء کے سالانہ اجتماع میں مجھ پر جمعیت کی دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال

دیا گیا تھا۔ ایک جمعیت لاہور کی نظامت کا ------ اور دوسرے جمعیت پنجاب کی نظامت کا ------ اور واقعہ یہ ہے کہ اس سال میں نے جس جوش و خروش اور تندہی سے کام کیا اس کا تصوّر اب کرتا ہوں تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جمعیت اگرچہ قائم بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی اور وہیں کئی سال تک اس کا مرکز قائم رہا تھا لیکن اُس وقت تک لاہور میں اس کی حیثیت طلبہ کے ایک لٹریری سرکل سے زیادہ نہ تھی۔ اور بقیہ پنجاب میں تو اس کا کہیں نام و نشان تک موجود نہ تھا۔ لے دے کر صرف راولپنڈی میں ایک جمعیت تھی جو کبھی ماضی میں کسی قدر فعال رہی تھی لیکن اس وقت اس کے صرف کچھ ''آثار'' باقی تھے اور وہ بھی نہایت خستہ اور بوسیدہ حالت میں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سال قبل جمعیت کا مرکز لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ پنجاب میں جمعیت نیم مردہ حالت میں ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ مَیں نے جیسے ہی اس کا چارج سنبھالا اس میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے --- --- چنانچہ مَیں نے ''تربیت گاہ'' سے فارغ ہوتے ہی جنوری ۱۹۵۲ء میں پورے پنجاب کا ایک طوفانی دورہ کیا' جس کے دوران کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے۔

ہوا یوں کہ مَیں اور برادرم نذیر احمد خالد (جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے ------ اور آج کل ایک غیر ملکی دوا ساز فرم میں اہم عہدے پر فائز ہیں) سیالکوٹ کے دورے کے لیے صبح چار بجے لاہور سے نکلے۔ طے یہ تھا کہ سکولوں میں تقریریں وہ کریں گے اور کالجوں میں مَیں کروں گا۔ انہوں نے اپنی تقریر خوب محنت سے تیار بھی کر لی تھی۔ لیکن سیالکوٹ میں جب پہلے ہائی اسکول میں جلسہ ہوا اور پانچ سات سو طلبہ اور پچیس تیس اساتذہ کا ''ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر'' ان کے سامنے آیا تو اُن کی گھگھی بندھ گئی ------ اور چند جملے کہنے کے بعد وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ بقیہ تقریر اسرار احمد صاحب کریں گے ------ میرے لیے ظاہر ہے کہ یہ ایک ناگہانی آفت سے کم نہ تھی' لیکن الحمدللہ کہ مَیں نے صورت حال کو سنبھال لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن میں مَیں نے تین ہائی اسکولوں میں تقریریں کیں اور دو کالجوں میں۔ ایک قدیم مَرے کالج (Murray College) اور دوسرے جناح اسلامیہ کالج

(جو اُن ہی دنوں قائم ہوا تھا اور اس کا غالباً پہلا ہی سال تھا)۔ اور صورت یہ رہی کہ ایک درسگاہ سے نکلے تو فوراً دوسری میں جا داخل ہوئے۔ نتیجتاً پورے دن کچھ کھانے پینے کا نہ ہوش آیا نہ موقع ملا۔ شام کو چار بجے فارغ ہوئے اور خیال ہوا کہ اب کچھ ''خورد و نوش'' کا معاملہ ہو گا تو جناب آسی ضیائی رامپوری نے اطلاع دی کہ لاہور کے لیے آخری بس کی روانگی کا وقت ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسی طرح خالی پیٹ لاہور واپسی ہو گئی' جہاں رات گئے پہنچنے کے باعث ہاسٹل کا کچن بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ رات بھی ویسے ہی خالی پیٹ بسر ہوئی------ بہرحال میری اس بھاگ دوڑ اور محنت و مشقّت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجاب میں جمعیت ایک دم فعال اور نمایاں ہو گئی۔ اور اب اس کی حیثیت طلبہ کے ایک مذہبی اور لٹریری سرکل سے بڑھ کر اسلامی تحریک کی ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی اطلاعات مولانا مودودی کو

بھی پنجاب کے طول و عرض سے مل رہی ہوں گی۔ اور اس کے نتیجے میں اُن کے دل میں میرے لیے شفقت و محبّت کے جذبات بڑھ رہے ہوں گے' جس کا ایک نمایاں اظہار بھی اُن ہی دنوں ہو گیا۔

فروری ۱۹۵۲ء میں مَیں نے لاہور میں جمعیت پنجاب کا ایک سہ ماہی اجتماع منعقد کیا۔ اور اس موقع پر برکت علی اسلامیہ ہال میں مَیں نے خود مولانا ہی کے زیر صدارت وہ تقریر کی جو جمعیت کے لٹریچر میں ''ہم اور ہمارا کام'' کے عنوان سے شامل ہے' تو مولانا نے اسے بہت سراہا۔ ان کے دو فقرے میری لوحِ قلب پر تا حال نقش ہیں------ ایک یہ کہ ''پاکستان کے طلبہ کے حالات کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے وہ آپ ہی کی زبان سے موزوں تھا ! یہی باتیں اگر ہم کہتے (واضح رہے کہ اس محفل میں مولانا اصلاحی بھی موجود تھے !) تو طلبہ کو شکایت ہو سکتی تھی'' اور دوسرا یہ کہ ''آپ نے اپنی اس تقریر میں جو کچھ کہا ہے ہم بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بس تھوڑا سا فرق صرف شخصیت کا باقی رہ جاتا ہے !'' مجھے اُس وقت بھی پورا احساس تھا کہ مولانا یہ باتیں میری حوصلہ افزائی کے لیے فرما رہے ہیں لیکن بہرحال اس میں محبّت و شفقت اور اپنائیت کے احساس کا جو رس گھُلا ہوا تھا میرے لیے اصل اہمیت اس کی تھی !---۱۹۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں مَیں نے ؎

''مشرف گرچہ شد جامی زِ لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کن !''

کے مصداق دسمبر ۱۹۵۱ء کی تربیت گاہ کے لطف کو مکرر اور دوبالا کرنے کے لیے پھر ایک طویل تر تربیت گاہ منعقد کی اور ایک بار پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے درسِ قرآن حاصل کیا اور تدبرِ قرآن کے اصول و مبادی سیکھے اور ''تزکیۂ نفس'' پر لیکچر سنے۔ اور مولانا مودودی سے درسِ حدیث حاصل کیا اور مختلف تحریکی مسائل پر تفصیلی گفتگوئیں سنیں۔ اور آزادانہ تبادلہ خیال ہی نہیں باقاعدہ بحث و تمحیص کے ذریعے دعوتی اور تحریکی معاملات میں بصیرت حاصل کی------ اس دوسری تربیت گاہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے دوران ہم نمازِ تہجد مولانا مودودی کی امامت میں ادا کرتے رہے-----اور تہجد کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی دلآویز ترتیل سے محظوظ ہوتے رہے۔ اور اس کے دوران میرے لیے کسی قدر قابلِ فخر اور دوسرے ساتھیوں کے لیے حد درجہ قابلِ رشک بات یہ رہی کہ اکثر مولانا اپنے کمرے سے ننگے سر ہی آجاتے تھے اور پھر میری قراقلی ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے تھے------ (میری وہ ٹوپی بعد میں جمعیت کے احباب کے حلقوں میں بہت عرصے تک مشہور رہی !)

اب صحیح یاد نہیں کہ یہ واقعہ دسمبر ۱۹۵۱ء کی تربیت گاہ میں پیش آیا تھا یا ۱۹۵۲ء کی موسمِ گرما کی تعطیلات کی تربیت گاہ میں------ لیکن ہے بہت دلچسپ اور قابلِ ذکر۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈارون کے نظریۂ

ارتقاء پر مولانا کی جو تحریر ''تفہیمات'' میں شامل ہے مجھے وہ پسند نہ تھی' چنانچہ مَیں نے اس پر تربیت گاہ کے دوران مولانا سے گفتگو کی اور ان کا نقطۂ نظر مزید وضاحت سے معلوم کیا۔ پھر مَیں نے مولانا اصلاحی صاحب سے بات کی تو انہیں کسی درجے میں نظریۂ ارتقاء کا قائل پایا۔ بس یہاں سے میری ''شرارت'' شروع ہوگئی۔ مَیں روزانہ مولانا اصلاحی سے نظریۂ ارتقاء کے حق میں قرآنی دلائل اور استشہادات حاصل کر لیتا اور پھر مولانا مودودی سے ان کی بنیاد پر بحث کرتا۔ مولانا میرے اس ''علم قرآنی'' سے حیران بھی ہوتے اور اس کی تحسین بھی فرماتے اور پھر اپنے اعتراضات وارد

کرتے۔ مَیں اگلے روز وہ اعتراضات مولانا اصلاحی کے سامنے رکھتا تو وہ بھی حیرت آمیز مسرّت کا اظہار فرماتے اور اپنے موقف کے حق میں مزید دلائل دیتے۔ تربیت گاہ کے بقیہ تمام شرکاء ان بحثوں کو سنتے اور محظوظ ہوتے اور میری ''قرآن دانی'' پر زیر لب مسکراتے بھی رہتے!) ------ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چرچا جماعت کے مرکزیں بھی ہوا اور وہاں یہ راز کھل گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بحث طلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ اصلاً مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہو رہی ہے' بواسطۂ اِسرار۔ چنانچہ جناب نعیم صدیقی نے ہمیں اس ''شرارت'' سے روکا۔ اور اس پر قدرے سرزنش بھی کی۔

بہرحال میری سال بھر کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں جب اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا تو ایک تو اس موقع پر اجلاسِ عام کسی ہال میں نہیں بلکہ پہلی بار ایک کھلے میدان (یعنی گول باغ لاہور) میں ایک جلسہ عام کی صورت میں منعقد ہوا------ اور دوسرے مجھے آئندہ سال (۱۹۵۲ء۔ ۱۹۵۳ء) کے لیے جمعیت کا آل پاکستان ناظمِ اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ اور اس طرح ایک تو جمعیت کا مرکز دوبارہ لاہور منتقل ہو گیا اور دوسرے میرے مولانا مودودی سے مزید قریبی روابط کی راہ نکل آئی۔ اس لیے کہ مختلف تنظیمی اور تحریکی مسائل پر مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے مَیں اکثر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا' جہاں میرے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی' بلکہ جماعت کے مرکز کے اکثر کارکن اس پر حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے اور کسی قدر رشک (یا حسد؟) میں بھی مبتلا تھے کہ اس کے باوجود کہ مولانا کی زندگی بہت منضبط تھی اور وہ اپنے اوقاتِ کار کی سختی سے پابندی نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی کرواتے تھے' میرے لیے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار مَیں اپنے چند ساتھیوں سمیت مولانا کی خدمت میں رات کے گیارہ بجے حاضر ہوا اور مولانا نے ہمیں اپنی خواب گاہ ہی میں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔

فروری ۱۹۵۲ء میں منعقدہ اجتماعِ جمعیت پنجاب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کا ایک

اور واقعہ بھی بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے اور آگے بڑھنے سے قبل اس کا تذکرہ مناسب رہے گا ------ ہوا یہ کہ مولانا نے جو تقریر اُس روز میری تقریر کے بعد فرمائی اس میں یہ الفاظ بھی تھے کہ ''مَیں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ایک جانب دعوتی اور تحریکی مشاغل میں بھرپور حصّہ لیں ------ لیکن دوسری جانب اپنی تعلیم میں بھی دوسروں سے ہرگز پیچھے نہ رہیں بلکہ اس میدان میں بھی اپنے ساتھی طلبہ سے آگے رہیں... !'' مَیں نے جب مولانا کی اس نصیحت کی روشنی میں اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ یہ ایک ناقابلِ عمل بات ہے۔ چنانچہ مَیں اسی رات مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور مَیں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سر آنکھوں پر' لیکن یہ ہے نا ممکن العمل ! ------ مَیں نے پرائمری سے اُس وقت تک کا پورا ریکارڈ مولانا کے سامنے رکھ دیا کہ مَیں نے پرائمری میں بھی وظیفہ حاصل کیا تھا' پھر مڈل کے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا' پھر میٹرک میں مَیں متحدہ پنجاب کے تمام مسلمان طلبہ میں چوتھے نمبر پر تھا اور میرے اپنے اسکول میں جو طالب علم میرے بعد دوسرے نمبر پر تھا اُس کے اور میرے نمبروں میں ۹۰ کا فرق تھا (میں نے کل ۸۵۰ میں سے ۷۱۸ نمبر حاصل کیے تھے اور اُس نے ۶۲۸) بعدازاں مَیں نے ایف ایس سی میڈیکل میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور میرٹ (merit) سکالر شپ حاصل کیا' پھر میڈیکل کالج میں فرسٹ ائیر میں مَیں کلاس میں اوّل رہا اور ایک مزید وظیفہ مجھے ملا (چنانچہ میڈیکل کالج کے سالِ دوم کے دوران میرے پاس دو وظائف تھے !) ------ لیکن اب جمعیت کی جو گوناگوں ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر آگئی ہیں ان کے پیش نظر میرے لیے نا ممکن ہے کہ مَیں اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھ سکوں ------ تو فرمایئے کہ مَیں کیا کروں؟-- ---- اس پر مولانا نے نہ صرف یہ کہ کھلے دل کے ساتھ اپنی غلطی کو تسلیم کیا بلکہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف فرمایا کہ ------ ''میرا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے جماعت اسلامی کی تحریک عوامی دور میں داخل ہوئی ہے میرا مطالعہ بالکل منقطع ہو چکا ہے اور اب مَیں صرف اپنے سابقہ مطالعے سے کام چلا رہا ہوں ! !'' ------ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ مولانا کے الفاظ مجھے تا حال جوں کے توں کیسے یاد رہ

گئے کہ مَیں انہیں واوین (یعنی (inverted commas) کے ساتھ نقل کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہ الفاظ میرے لوحِ قلب پر کندہ ہیں' اس لیے کہ میری اپنی زندگی کے آئندہ رخ کی تعیین میں ان کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں دُنیوی مستقبل (career) اور پیشہ و فن (profession) کو ثانوی درجہ دینے اور دعوت و اقامت ِدین کی جدّوجُہد کو اوّلیت دینے کا فیصلہ غیر شعوری طور پر نیم دلی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری طرح جانتے بوجھتے اور خالص شعوری طور پر کیا تھا اور اس میں مولانا کے ان الفاظ کو بھی اہم دخل حاصل ہے------ !

۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لیے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا۔ چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لاء نافذ ہوا۔ اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دُور رَس اثرات مترتّب ہوئے۔

۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلسِ احرار کے اُن زعماء نے کیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیرِ اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک اینٹی قادیانی تحریک کا علَم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے------ لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گے۔ دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرِفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علماء کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ قیادت کانگریس کے ہمنوا رہے تھے------ اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی علماء اور ثانیاً بریلوی مکتب فکر کے علماء و زعماء تھے------ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی اس معاملے میں بالکل ع ''نے تابِ وصل

دارم نے طاقت جدائی !'' والے مخمصے میں بتلا ہو گئے تھے' اس لیے کہ جماعت کی تاسیس جن اصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی اُن کی رو سے اس کا اس تحریک میں حصّہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا------ لیکن سیاسی اکھاڑے میں اُتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا معاملہ مسلسل ''نیمے دروں نیمے بروں'' کا رہا' یعنی یہ کہ ''بظاہر'' تحریک میں شامل بھی ہیں لیکن ''بباطن'' اس سے علیحدہ اور بَری بھی ! !

بہرحال اِس وقت پیش نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں' بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اُس زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز ''متحدہ مجلسِ عمل'' نے ''راست اقدام'' یعنی "direct action" کے آغاز کا اعلان کیا اور جماعت اسلامی کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں ''البتہ ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے'' اُس روز مَیں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار اُن کی زبان سے

انگریزی کا ایک محاورہ سنا۔ مولانا نے فرمایا: ''ہم اس پوری صورتِ حال سے With Flying Colours نکلے ہیں!'' ------لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ خوش فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے ''جوابی اقدام'' کی لپیٹ میں دوسرے علماء و زعماء کے ساتھ ساتھ مولانا بھی آ گئے بلکہ وقت کے بعض ''فراعنہ'' نے جو موقع کی تاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مقدّمہ قائم کر دیا۔

یہ زمانہ' جمعیت اور جماعت کے ہزاروں کارکنوں کی طرح مجھ پر بھی رنج و غم کی شدّت اور حزن و ملال کے غلبے کا تھا۔ (۱۹۵۳ء کو عہدِ حاضر کی اس اسلامی تحریک کا جو جماعت اسلامی کے تحت جاری تھی ''عام الحزن'' قرار دیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہو گی!) جب تک لاہور سنٹرل جیل میں مقدّمے کی سماعت جاری رہی مَیں روزانہ وہاں جاتا

رہا------ اور مقدّمے کی کارروائی سننے کے ساتھ مولانا کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا اور ان کے صبر و سکون سے خود اپنے جذبے اور ولولے کے لیے حرارت حاصل کرتا رہا۔ چوہدری نذیر احمد مرحوم کا ''دفاع'' میرے اندازے میں اتنا جاندار نہ تھا جتنی توقع تھی------جبکہ سرکاری وکیل (غالباً اعوان صاحب) کا آخری جوابی حملہ بہت زور دار تھا۔ اور میرا دل اُسی وقت ڈوب سا گیا تھا۔ تاہم جب تک فیصلے کا اعلان نہ ہوا ایک اُمید سی قائم رہی------ لیکن جب پھانسی کی سزا کا اعلان ہوا تو اعصاب پر بجلی سی گری اور ایک بار تو دنیا اندھیر ہو گئی! اُس وقت جو کیفیت ہم سب کی تھی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ تاہم مایوسی کے اس غلبے اور رنج و غم کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہم سب کے لیے جو چیز نہایت ہمت افزا اور حد درجہ حوصلہ بخش تھی وہ یہ کہ مولانا نے پھانسی کی سزا کا حکم بھی نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنا اور بعد میں بھی پھانسی کے سزایافتہ قیدیوں کے مخصوص کپڑے پہننے سے لے کر کال کوٹھڑی میں داخل کیے جانے اور وہاں موت کے انتظار کے صبر آزما لمحات میں کسی بھی مرحلے پر ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

مَیں اُن دنوں لاہور سے جمعیت کے زیر اہتمام پندرہ روزہ ''عزم'' شائع کیا کرتا تھا جس کی ادارت کے فرائض مَیں اور ڈاکٹر سید اسلم (حال' اسسٹنٹ پروفیسر' انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیوویسکلر ڈیزیزز' کراچی) مشترکہ طور پر سر انجام دیتے تھے۔ مَیں نے اس موقع پر اس میں ایک تو حضرت جگر مراد آبادی کی وہ غزل شائع کی جو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ خاص اسی موقع کے لیے کہی گئی تھی ؎

یہ صحن و روش یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اَسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا، لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صَرفِ بہاراں ہوتے ہیں

اور ؎
جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں !

اور دوسرے جناب رئیس امرو ہوی کا ایک قطعہ بھی جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا، تھوڑے سے تصرف کے ساتھ شائع کیا: ؎
وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے !
سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا، غموں سے اندوہگیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیسؔ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے !

اس کے آخری شعر کو میں نے ''رئیس'' کی زیر کے ساتھ شائع کیا۔ گویا مصرعہ یوں بن گیا کہ ع ''رئیس اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں !'' اور اس طرح یہ تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کی جانب سے پیغام بن گیا تحریکِ اسلامی کے قائد و رئیس کے نام ! !
بہرحال خدا خدا کر کے رنج و غم کے یہ بادل چھٹے، مولانا کی سزا میں تخفیف ہوئی اور اگرچہ طویل اسیری کی جدائی کا خیال سوہانِ روح تھا، تاہم یہ اطمینان ہو گیا کہ ------ یار زندہ صحبت باقی !

دوسری جانب ۱۹۵۳ء ہی میں پاکستان کے طول و عرض میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طلبہ نے سر اٹھایا اور ایک ملک گیر تحریک شروع کر دی جس کا عنوان تھا: ''طلبہ کے مسائل اور مشکلات''۔ اس تحریک کا اصل مرکز کراچی تھا اور

وہاں ان عناصر نے تقریباً تمام کالجوں کی یونینوں پر قبضہ کر کے ایک ''بین الکلیاتی ادارہ'' Intercollegiate Body کے نام سے قائم کیا جس کا مخفف I.C.B تھا اور طلبہ کے مسائل اور مشکلات کے حوالے سے بھرپور ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اُس وقت کی کراچی جمعیت کی قیادت نے اس صورت حال سے بایں طور عہدہ برآ ہونے کی سعی کی کہ اپنے پرچے ''اسٹوڈنٹس وائس (Students' Voice)'' کو طلبہ کے مسائل کا سب سے بڑا علمبردار بنا دیا جس نے کُویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لیکن جب ایجی ٹیشن کی آگ پوری طرح بھڑکی تو معلوم ہوا کہ اس کی قیادت میں جمعیت کا کوئی حصّہ نہیں ہے------ بلکہ قیادت کُل کی کُل I.C.B کے ہاتھ میں ہے------مَیں لاہور میں بیٹھا اس صورتِ حال کو سخت پریشانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ جمعیت کے وسائل اُن دنوں بہت محدود تھے اور ہوائی سفر تو بالکل ہی خارج از بحث تھا' لہٰذا اس کے باوجود کہ ناظمِ اعلیٰ مَیں تھا اور میرے نزدیک جمعیت کراچی کی یہ روش سخت غلط تھی تاہم مَیں بالکل اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہ تھا------اُن دنوں مَیں بارہا مولانا کی خدمت میں خاص اس مسئلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ تو اگرچہ وہ خود اپنے معاملات اور اینٹی قادیانی تحریک سے پیدا شدہ مسائل میں بہت الجھے ہوئے تھے تاہم میری باتیں پوری توجّہ اور غور سے سنتے اور میرے ساتھ اتفاقِ رائے کا اظہار فرماتے' لیکن ایک تو خود اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کے باعث اور دوسرے اس بنا پر کہ جمعیت قانوناً جماعت کے تابع نہ تھی اس ضمن میں اثر انداز ہونے سے معذوری کا اظہار فرماتے۔

تاہم جب کراچی کے قائدین کراچی میں اپنی فتح کے جھنڈے لہراتے عازمِ پنجاب ہوئے تو مَیں نے آگے بڑھ کر ملتان ہی میں ان کا بھرپور ''خیر مقدم'' کیا۔ اور پھر لاہور' لائل پور (حال فیصل آباد) اور راولپنڈی ہر جگہ ان کا پیچھا کر کے ان کی مہم کو بالکل ناکام بنا دیا۔ اگرچہ لاہور کے بعض طلبہ کی جانب سے مجھے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں اور خود جمعیت لاہور کے بعض عناصر بھی میرے اس طرزِ عمل کے مخالف رہے' لیکن الحمدللہ کہ مولانا مودودی نے میرے اس طرزِ عمل سے پورا اتفاق فرمایا' اس پر ہر طرح

صاد کیا' اور وہ میری ہر طرح سے ہمت افزائی فرماتے رہے' تا آنکہ وہ خود اس مخمصے میں گرفتار ہو گئے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

تاہم اس مسئلے پر میرے اور کراچی جمعیت کی اُس وقت کی قیادت کے درمیان شدید اختلافِ رائے پیدا ہو گیا جس میں بَعد میں بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئیں اور خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ نتیجتاً میں نے دورانِ سال ہی جمعیت کی نظامت ِ علیا کی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی اور آئندہ سالانہ اجتماع تک کے لیے ایک ''قائم مقام ناظمِ اعلیٰ'' کا تقرر کر دیا۔ اور آئندہ سالانہ اجتماع کے موقع پر جو نومبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں منعقد ہوا' جہانگیر پارک میں منعقدہ ایک جلسۂ عام میں زیر صدارت ڈاکٹر عمر حیات ملک مرحوم ایک مفصل تقریر (جو ایک گھنٹہ چالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی) ''طلبہ کے مسائل اور ان کے حل'' ہی کے موضوع پر کی 'جس میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ اس تقریر کے بارے میں جو انتہائی تحسین آمیز جملے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہے وہ برادرم ظفر اسحٰق انصاری نے ''اسٹوڈنٹس وائس'' میں شائع شدہ رپورٹ میں درج کر دیے تھے۔ لیکن میرے لیے سب سے بڑھ کر مسرّت بخش اور حوصلہ افزا واقعہ یہ تھا کہ جیسے ہی میں تقریر ختم کر کے ڈائس سے نیچے اترا ایک عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ نے دوڑ کر مجھے گلے لگا لیا اور فرمایا: ''جتنی دیر تم وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے مَیں وہاں تمہاری بجائے مولانا مودودی کو دیکھتا رہا!''------ کافی دیر تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھنے کے بعد جب انہوں نے مجھے علیحدہ ہونے کی اجازت دی تو مَیں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جن سے اُن کی داڑھی بھیگ گئی تھی۔ اِن آنسوئوں میں غالباً مولانا مودودی کی اسیری کا غم بھی شامل تھا اور اس بات کی خوشی بھی کہ جو شمع انہوں نے روشن کی ہے اُس کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے والے بہت سے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں۔ یعنی ؎

گئے دن کہ تنہا تھا مَیں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

باب سوم

'یادِ یارِ مہرباں آید ہمے'

(۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ء کا تحریر کردہ مضمون جو اکتوبر ۱۹۹۲ء کے ''یثاق'' میں شائع ہوا)

آج ۲۲ ستمبر ۱۹۹۲ء ہے۔ گویا مولانا مودودی مرحوم کو اس جہانِ فانی سے دارالخلد منتقل ہوئے پورے تیرہ برس بیت چکے ہیں۔

مَیں نے اُن کے انتقال کے لگ بھگ تین برس بعد اپنے پہلے سفرِ امریکہ کے موقع پر مولانا سے ملاقات کی شدید خواہش، لیکن ان کے اچانک انتقال کے باعث ۲۲، ستمبر ۱۹۷۹ء کو بفلو میں ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے مکان پر مولانا کے صرف جسدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی ایک تأثراتی روداد تحریر کی تھی جو ستمبر ۱۹۸۲ء کے ''یثاق'' میں شائع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے ''تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را!'' کے مصداق مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی ربط و تعلق کی داستان لکھنی شروع کی تھی جس کی قسطِ اول میں ۴۶۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۳ء تک کے حالات و واقعات کا اجمالی خاکہ آگیا تھا۔ یہ قسط بھی اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد قلم پر سخت گرہ لگ گئی جو پورے دس سال لگی رہی۔

چند روز قبل ماہ ستمبر کی مناسبت سے ع ''یادِ یارِ مہرباں آید ہمے!'' کے مطابق پھر کچھ ''داغ ہائے سینہ'' تازہ ہو گئے اور ارادہ ہوا کہ اس ''آخر'' اور ''اوّل'' کے مابین خَلا کو، خواہ اختصار کے ساتھ ہی سہی، کسی طور پاٹ دیا جائے------ تو پہلے تو خوف سا محسوس ہوا کہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۹ء تک چھبیس (۲۶) برس پر پھیلی ہوئی داستان، اور وہ بھی اب جبکہ اس کے خاتمے کو بھی تیرہ برس بیت چکے، کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن پھر ایک تو یہ خیال آیا کہ اب سے چار سال قبل مولانا مرحوم کے ساتھ اپنے ذہنی اور قلبی تعلق کے نشیب و فراز کا ایک

مختصر خاکہ قلم سے ''صادر'' ہو کر میثاق ستمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہو گیا تھا۔ اب اگر اسے سامنے رکھ کر اس میں کچھ معیّن واقعات کا رنگ بھر دیا جائے تو کام زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ اور دوسرے دو روز قبل جب ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی کا شمارہ مورخہ ۲۴؍ ستمبر ۱۹۹۲ء اور اس سے قبل کا شمارہ (مورخہ ۱۷؍ ستمبر ۱۹۹۲ء) نظر سے گذرا تو احساس ہوا کہ ع ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث ِتاخیر بھی تھا!'' کے مصداق یہ تاخیر بھی حکمت و مشیّتِ خداوندی سے ہوئی ہے! اور غالباً اس داستان کی تکمیل کا موزوں ترین وقت یہی ہے۔ چنانچہ اللہ کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ السّعی مِنّی والاِتمام من اللہ!

اب سب سے پہلے مناسب ہے کہ ۱۹۸۸ء کا تحریر کردہ متذکرہ بالا خاکہ (شائع شدہ میثاق ستمبر ۱۹۸۸ء) سامنے آ جائے۔ اس کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ میں وسط اکتوبر ۱۹۷۰ء تا وسط فروری ۱۹۷۱ء پاکستان سے باہر رہا تھا۔ یہ عام حساب سے چار ماہ بنتے ہیں' اور تبلیغی بھائیوں کے حساب سے ''تین چلّے''۔ ان میں پورا ماہ رمضان المبارک بھی شامل تھا جو میں نے مدینۂ منورہ میں بسر کیا تھا۔ بعدازاں ایک ماہ کے لیے برادر عزیز ابصار احمد کی دعوت پر انگلستان چلا گیا تھا۔ وہ ریڈنگ یونیورسٹی سے 'ایم فِل' کرنے کے بعد اُن دنوں لندن یونیورسٹی میں 'پی ایچ ڈی' کی تکمیل کر رہے تھے۔ وہاں سے پھر واپسی حجازِ مقدّس ہی ہوئی' جہاں حج کی سعادت حاصل کی۔ ذیل کا اقتباس لندن سے حجاز واپسی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے:

''واپس سعودی عرب پہنچا تو یہ غالباً جنوری ۱۹۷۱ء کی اٹھارہ تاریخ تھی اور اتفاقاً جدّہ ہی میں رائو محمد اختر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے مدینۂ منورہ کی عیدالفطر کے دن والی ملاقات کے بعد پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج کی بنا پر وہ نہایت پژمردہ اور مضمحل تھے' میں نے لوہا گرم سمجھ کر کہا: ''رائو صاحب! کیا اب بھی آپ لوگ اپنے اندازوں اور طریق کار پر نظرثانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؟'' ------ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تڑخ کر جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب! اب تو اگر خود مولانا مودودی بھی طریق کار کو

تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے‘ تو ہم انہیں بھی ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے !‘‘------مجھے اُس وقت تو اُن کی بات ایک ’’جذباتی طوفان‘‘ (emotional outburst) کا مظہر نظر آئی ‘لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ فی الواقع جماعت کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی تھی !

مکّہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا------تو وہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے ملاقات ہوئی‘ انہوں نے بتایا کہ اُن کے پاس مولانا مودودی کی اُس تقریر کا ٹیپ پہنچ گیا ہے جو انہوں نے لاہور کے ایک اجتماعِ کارکنان میں انتخابات میں جماعت کی بُری طرح ناکامی پر جماعت ہی کے حلقے کے بعض صحافیوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں کی تھی۔ (واضح رہے کہ یہ وہی صحافی تھے جو انتخابات سے قبل جماعت اسلامی کی شاندار متوقع کامیابی کے ضمن میں مبالغہ آمیز اندازے شائع کرتے رہے تھے‘ لیکن اب جبکہ نتیجہ برعکس نکل آیا تھا تو جماعت کی بعض حکمت عملیوں اور بالخصوص طریق تنظیم کو ہدفِ تنقید بنا رہے تھے !)------چنانچہ مَیں نے اُن کے مکان پر حاضر ہو کر اس تقریر کا ریکارڈ سنا تو مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مولانا کسی جیوری کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہو کر صفائی پیش فرما رہے ہوں۔ چنانچہ اس پر مَیں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے-----کہ اللہ اکبر! کس قدر دردناک اور حسرتناک معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی دعوت و خدمت ِدین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت ِدین کی جدّوجُہد میں صَرف کر دی‘ اور علّامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

اِک ولولۂ تازہ دیا مَیں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند !

بلامبالغہ لاکھوں انسانوں کو متأثر کیا------ اور ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے انہیں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کا سپاہی بنا دیا‘ عمر کے آخری حصے میں اپنے ہی عقیدت مندوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے----- - اور اپنے بیٹوں کی عمر کے نوخیز و نو مشق صحافیوں کے سامنے اپنے بعض اساسی نظریات‘ بالخصوص ہیئت ِتنظیمی کا

دفاع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے------فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!

بہرحال اواخر جنوری ۱۹۷۱ء کی کسی تاریخ کو مکہ مکرمہ میں زبیر عمر صدیقی صاحب کے مکان پر جو چند آنسو میری آنکھوں میں بے اختیار اُمڈ آئے تھے انہوں نے میرے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا جو ۱۹۶۲ء کے بعد

سے مولانا مودودی کے ساتھ کدورت کی بنا پر جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے------کہ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرا تعلق اتار چڑھائو کے متعدد ادوار سے گزرا ہے' اور ان کے بارے میں میرے احساسات اور قلبی کیفیات میں کئی بار تغیر و تبدّل ہوا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی پندرہ سے اکیس برس عمر کے دوران اُن کے ساتھ میرا تعلق غایت درجہ محبّت اور احترام ہی کا نہیں' انتہائی عقیدت کا بھی تھا۔ اور مَیں اپنے چھوٹے سے ذہن اور محدود معلومات کی بنا پر انہیں نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد اُمت ِمسلمہ کا عظیم ترین فرد سمجھتا رہا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار اِدھر لاہور اورپنجاب میں تحریکِ ختم نبوت کے ضمن میں جماعت اسلامی کے رول اور اُدھر کراچی میں طلبہ کی کمیونسٹ تحریک کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رول سے میرے ذہن میں اوّلین شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں اس اختلافی سوچ کا آغاز ہوا جو ۵۶۔ ۱۹۵۵ء تک اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی اور نومبر ۱۹۵۶ء میں اُس اختلافی بیان کی صورت میں ضبطِ تحریر میں بھی آ گئی جو پورے دس سال بعد (۱۹۶۶ء میں) ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع ہوا---- -- اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ عقیدت کا تو خاتمہ ہو گیا' تاہم محبّت اور احسان مندی کا جذبہ برقرار رہا۔

۳۔ ۱۹۵۶ء سے اپریل ۱۹۵۷ء تک مولانا مرحوم کے بعض اقدامات کی بنا پر ان کے ساتھ حسنِ ظن کو شدید صدمہ پہنچا ------لیکن اس کے باوجود ایک گونہ دلی تعلق بھی برقرار رہا ------اور احسان مندی کے جذبات میں بھی کوئی کمی نہیں

آئی------اور اپریل ۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد سے اپریل ۶۲ء تک یہ کیفیت علیٰ حالہٖ برقرار رہی۔ چنانچہ ابتدا میں تو مَیں ملاقات کے لیے بھی حاضر ہوتا رہا ‘اور اگرچہ یہ محسوس کر کے کہ مولانا بھی میری آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور ۵۔ اے ذیلدار پارک کی عمومی فضا میں تو بہت ہی ناگواری پائی جاتی ہے‘ یہاں تک کہ بعض لوگوں کے چہرے تو ہو بہو ’’تَعرِفُ فِی وُجُوھِھِمُ المُنکَرَ‘‘ کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں‘ مَیں نے آمد و رفت تو بند کر دی------تاہم مولانا سے کوئی قلبی بُعد پیدا نہیں ہوا اور احسان مندی کے جذبات تو جوں کے توں قائم رہے-----

-چنانچہ اپریل ۶۲ء میں حج کے لیے روانگی سے قبل مَیں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ: ’’مولانا ! مَیں حج کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگرچہ جماعت کی پالیسی سے میرا اختلاف نہ صرف علیٰ حالہٖ قائم ہے بلکہ شدید تر ہو گیا ہے------ لیکن میرے دل میں آپ کی جانب سے کوئی کدورت نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری جانب سے کوئی مَیل ہو تو آپ بھی اسے صاف فرما لیں !‘‘------ اس پر مولانا نے بڑے اطمینان اور انشراح کے ساتھ فرمایا: ’’آپ بالکل مطمئن رہیں‘ میرے دل میں آپ کی جانب سے ہرگز کوئی میل نہیں ہے !‘‘------یہی وجہ ہے کہ جب میری روانگی کے بعد دفعۃً مولانا کو سعودی حکومت کی جانب سے ’’رابطۂ عالم اسلامی‘‘ کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور چند روز بعد وہ بھی حجازِ مقدّس پہنچ گئے تو مَیں نے ان سے متعدد بار مکہ مکرمہ میں فُندق مصر میں ملاقات بھی کی اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں کچھ گفتگو بھی کرنی چاہی۔ اگرچہ اس کا جواب مجھے بہت حوصلہ شکن ملا۔

۴۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک جانب جمہوریت کے عشق میں جس انتہا پسندی کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر بلکہ ملحد عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی‘ اور مبالغہ آرائی اس حد تک پہنچ گئی کہ صدر ایوب خان بمقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے باب میں یہ الفاظ تک کہہ دیے گئے کہ: ’’ایک

جانب ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے‘ اور دوسری جانب ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے !‘‘------ اور دوسری طرف عوامی توجّہ کا مرکز بننے کے لیے دینی اعتبار سے اس درجہ پستی اختیار کر لی گئی کہ ’’غلافِ کعبہ کی رام لیلا‘‘ منعقد کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہ کیا --- ----وغیر ذالک------تو‘ مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ‘ میرے دل میں محبّت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ یہاں تک کہ احسان مندی کے جذبات بھی اس منفی جذبے کے نیچے دب کر رہ گئے------یہی سبب ہے کہ میری ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۰ء کی تحریروں میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے !

۵۔ اور یہی وہ کیفیت تھی جس میں ایک اچانک انقلاب اواخرِ جنوری ۱۹۷۱ء کی اس شام کو مکہ مکرمہ میں آیا' جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جس کے نتیجے میں نفرت کی جگہ تاسف آمیز حسرت نے لے لی' اور اگرچہ اختلاف پوری شدّت کے ساتھ قائم رہا------ تاہم قلب کی گہرائیوں سے ذاتی احسان مندی کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا جو بحمد اللہ آج تک برقرار ہے !

۶۔ لیکن اس کے بعد بھی مولانا سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی۔ اس لیے کہ ایک تو اس طویل عرصے کے دوران بہت سے اسباب کی بناپر' اور بالخصوص میری اپنی بعض تحریروں کے باعث حجابات بہت گہرے ہو چکے تھے------ دوسرے پالیسی کا اختلاف جوں کا توں برقرار تھا------ اور یہ بات میرے علم میں بہت دیر کے بعد آئی کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی شکست کے بعد مولانا اپنی بعد از تقسیم ہند پالیسی سے مایوس ہو گئے تھے اور تہ دل سے چاہتے تھے کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن اب کچھ اپنی ضعیفی اور علالت' اور کچھ جماعت کے کارکنوں' اور بالخصوص اس کی نئی قیادت کے مزاج میں سیاسی رنگ کے پختہ ہو جانے کے باعث وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے------ بہرحال' جب میرے علم میں یہ حقائق آئے تو فطری طور پر دل میں ملاقات کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی 'لیکن جن ذرائع سے مولانا کے نقطۂ نظر کی تبدیلی کا علم حاصل ہوا تھا ان ہی کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے گرد جماعت کا حفاظتی حصار بہت سخت ہے' اور اوّل تو اُن سے میری ملاقات ہی محال کی حد تک مشکل ہے' ثانیاً اس کی توقع بہت کم ہے کہ مولانا کھل کر

بات کر سکیں۔ لہٰذا اس ''سعی لا حاصل'' کا ارادہ ترک کر دیا۔

۷۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اگست میں امریکہ سے ایک زوردار دعوت موصول ہوئی اور مَیں نے اسے قبول کر لیا تو اس خیال کے تحت کہ مولانا بھی آج کل وہیں مقیم ہیں دل میں دبی ہوئی خواہش کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پختہ ارادہ کر لیا کہ وہاں ملاقات ضرور کروں گا ------ لیکن افسوس کہ جیسے ہی میں امریکہ پہنچا' مولانا شدید علیل ہو گئے' اور شدید خواہش کے باوجود ان سے زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف ان کے مُردہ جسد خاکی کی زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت نصیب ہو سکی ------ اور اس موقع پر مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق کے اِس جملے نے میری حسرت کو دو چند کر دیا کہ ''ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہش مند تھے' لیکن ان کے معالجین کی سخت ہدایت تھی کہ ان سے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہ ملنے پائے !''

اِس خاکے کی شق نمبر ۷ کی تفصیل میری سولہ صفحات سے زائد پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں موجود ہے جو ستمبر ۱۹۸۲ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوئی تھی' اور شق نمبر ۱ کی بیس صفحات سے زائد پر مشتمل تفصیل اکتوبر ۱۹۸۲ء کے میثاق میں شائع ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جس خلا کو پُر کرنا مطلوب ہے اس کے لیے اوپر اوّل اور آخر کی بجائے آخر اور اوّل کے درمیان کے خَلا کے الفاظ استعمال ہوئے۔ اب ذیل میں درمیان کی پانچ شِقوں کے ضمن میں یہ سلسلہ وار گزارشات پیش ہیں۔

شق نمبر ۲ کے ضمن میں جہاں تک ۱۹۵۳ء کی ختم نبوت تحریک میں جماعت اسلامی کے رول کا تعلق ہے اُس وقت مَیں نے یہ تو ضرور محسوس کر لیا تھا کہ وہ جماعت کے سابق اصولی موقف سے مطابقت نہیں رکھتا اور صرف وقتی سیاسی دباؤ کا نتیجہ ہے' لیکن اُس وقت تک میرا تجزیہ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ مزید برآں مَیں اُس وقت جماعت کے اندرونی حالات سے بھی قطعاً واقفیت نہیں رکھتا تھا' اس لیے کہ مَیں پورے پانچ سال سے کلیۃً اسلامی جمعیت طلبہ ہی کے حلقے میں مصروف و مشغول تھا۔ یہ راز کہ جماعت اسلامی

کے اخلاقی زوال کا آغاز ہو چکا ہے مجھ پر دو سال بعد ۱۹۵۵ء میں کھلا جب میں جماعت اسلامی کا رُکن بن کر جماعت کے حلقہ اوکاڑہ کے نظم سے وابستہ ہوا۔ البتہ جہاں تک اسلامی جمعیت طلبہ کی کراچی کی قیادت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں مجھے اُسی وقت شدید تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اور اُس کے جس کردار اور رویّہ کا مظاہرہ میرے علم میں ۱۹۵۳ء کے جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر آیا تھا شاید اس کی وضاحت اور صراحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے آج ہی کا وقت طے کیا ہوا تھا اور اسی لیے آج سے دس سال قبل میرے قلم پر گرہ لگا دی تھی جو اَب کھلی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مَیں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے ''میثاق'' میں شائع ہونے والی قسطِ دوم ٹھیک اسی مقام پر آکر ختم ہوئی تھی کہ ۱۹۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی کے جلسۂ عام کا ذکر تو ہو گیا تھا لیکن تنظیمی امور بیان نہیں ہوئے تھے۔

اس لیے کہ ہفت روزہ تکبیر کی ۱۷ر اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۹۲ء کی اشاعتوں میں میاں طفیل محمد' جناب

نعیم صدیقی‘ اور چودھری نذیر احمد کی تحریروں سے جماعت کے موجودہ خلفشار کی جو تصویر سامنے آتی ہے اور جماعت کے قدیم ترین ''السابقون الاولون'' کے ''بقیۃ الزمان'' اور مولانا مودودی مرحوم کے قریب ترین ساتھیوں کا جو حال نظر آتا ہے کہ وہ ع

''میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا !''

سے گزر کر ے ''دشنام‘ نالہ‘ ہاوہو‘ فریاد کچھ تو ہو۔ چیخے ہے درد اے دلِ برباد کچھ تو ہو !''کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں‘ یہ سب ایک ''قبضہ گروپ'' کی کارستانیوں کا مظہر ہے جو جماعت کی قیادت پر قابض ہو گیا ہے--- --- اور اس گروپ کا آغاز اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کی ۵۳۔ ۱۹۵۲ء کی ''قیادت'' کی صورت میں ہوا تھا !

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء کے اوائل میں جب مَیں جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا مَیں جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس کے موقع پر اپنے لاہور جمعیت کے چند ساتھیوں کی معیت میں جماعت کے مرکز واقع ۵۔ اے‘ ذیلدار پارک‘ اچھرہ میں جماعت کے اکابر سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تھا تو اس موقع پر چوہدری غلام محمد مرحوم (امیر جماعت اسلامی حلقۂ سندھ) اور شیخ سلطان احمد صاحب نے مجھ سے یہ شکایت کی تھی کہ ''کراچی کی جمعیت کے قائدین ہم سے تو دُور دُور رہتے ہیں لیکن مولانا ظفر احمد انصاری (جو اَب فوت ہو چکے ہیں‘ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے !) سے بہت گھلے ملے رہتے ہیں اور ساری رہنمائی اور مشورے اُن ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ مزید برآں اُن پر اخوان کے بعض قائدین بالخصوص ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کا رنگ بہت چڑھتا جارہا ہے !''

اس سے قبل مَیں اور جمعیت لاہور کے بعض دوسرے ساتھی خود بھی یہ محسوس کر چکے تھے کہ ایک تو کراچی جمعیت کے بعض نمایاں رفقاء محبّت اور اخوت کے جذبات کے اظہار میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں کہ ''تصنّع'' تک کی بُو آنے لگتی ہے‘ اور دوسرے وہ آپس میں ایک مضبوط گروپ یا جتھے کے مانند مربوط اور منظّم ہیں‘ اور اپنے پہلے سے طے شدہ فیصلوں اور منصوبوں کو کھسر پھسر اور سرگوشیوں کے ذریعے منوا لینے کے فن میں ماہر اور مَشّاق ہیں‘ لیکن ہم نے اسے اُس وقت تک صرف پنجاب اور کراچی کی ''آب و ہوا'' اور پنجابی اور ''ہندوستانی'' مزاج کے فرق و تفاوت پر محمول کیا تھا ------متذکرہ بالا دو بزرگوں کی شکایت سے اندازہ ہوا کہ ہمارے اس مشاہدے کا جزوِ اوّل ان حضرات کے عرب رہنمائوں سے میل جول کا مظہر ہے‘ اس لیے کہ ملاقات کے موقع پر غیر معمولی گرم جوشی کا اظہار عربوں کا خصوصی وصف ہے‘ اور جزوِ ثانی مولانا ظفر احمد انصاری کی بالواسطہ ''قیادت'' کا۔ اس لیے کہ مولانا انصاری خیالات و نظریات کے اعتبار سے خالص و مخلص اور کٹر مسلم لیگی‘ مزاج

کے اعتبار سے صد فی صد ''عملی'' اور خالص سیاسی' اور گفتگو اور مذاکرات کے فن کے بے پناہ ماہر تھے ! (یہی وجہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے انہیں ''مذاکرات کا

بادشاہ'' قرار دیا تھا !) لہٰذا انہوں نے کراچی جمعیت کو مولانا مودودی مرحوم کی خالص اصولی اور نظریاتی نہج سے ہٹا کر ''عملی سیاست'' کے رخ پر ڈال دیا۔ اور اسی کا مظہر جمعیت کراچی اور بالخصوص اس کے آرگن ''اسٹوڈنٹس وائس'' (Students' Voice) کا طلبہ کے مسائل اور ان کے ''حقوق'' کی علمبرداری کا خالص سیاسی رول تھا جس کا ذکر میری اس سے قبل کی تحریر میں آچکا ہے------ اور جس کے بارے میں مَیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس سے مولانا مودودی مرحوم بھی سخت نالاں اور پریشان تھے !

کراچی جمعیت کی اصل قیادت اُس وقت تین اشخاص پر مشتمل تھی۔ اس کے سرخیل اور ماسٹر مائنڈ خورشید احمد صاحب تھے' (جو اب سینیٹر پروفیسر خورشید احمد ہیں !) مذہبی درس و تدریس اور جذباتی تقریر کی اہلیت کے حامل ہونے کے اعتبار سے اس گروپ کے عمومی ''ترجمان'' (spokesman) کی حیثیت جناب خرم جاہ مراد کو حاصل تھی' (جن سے میری عزیزداری بھی ہے !) ------ یہ دونوں حضرات اِس وقت جماعت اسلامی کے ''نائب اُمراء'' میں شامل اور بظاہر موجودہ امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب کے دست و بازو' لیکن اصلاً ان کے مشیر' مربی' اور سرپرست ہیں------ کراچی جمعیت کی اُس وقت کی قیادت کی ''تثلیث'' کی ''اقنومِ ثالث'' یا تیسری شخصیت مولانا ظفر احمد انصاری (مرحوم) کے پسر اکبر ظفر اسحٰق صاحب تھے (موجودہ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری' ڈائریکٹر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد) جو ایک جانب فطری طور پر مولانا ظفر احمد انصاری اور اس گروپ کے مابین واسطہ کے فرائض باحسن وجوہ سر انجام دیتے تھے اور دوسری جانب ''الوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہ'' کے مصداق ''سرگوشیوں'' میں طاق و مشّاق ہونے کے اعتبار سے اس تثلیث میں ''روح القدس'' کی سی حیثیت رکھتے تھے !

جمعیت کے ۱۹۵۳ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر اس گروپ نے جمعیت کے مرکز کو لاہور سے کراچی منتقل کرانے اور خورشید صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کرانے میں اپنی فنی مہارت کا جو مظاہرہ کیا اس کے سامنے مَیں اور رفقاءِ جمعیت لاہور بالکل اسی طرح بے بس ہو گئے تھے جس طرح آج میاں طفیل محمد اور جناب نعیم صدیقی قاضی حسین احمد صاحب کی

''انتخابی مہم'' کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ اور خود مجھے یہ تلخ حقیقت اس طرح برملا بیان کرنے کی ہمت اس لیے ہو گئی ہے کہ اب جماعت کے یہ اکابر اس کا اعلان بابانگ دہل کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی میں جماعتی عہدیداروں کے انتخابات تک میں ''دھاندلیاں'' ہوتی ہیں' اور ''کاروان دعوت'' دراصل قاضی حسین احمد صاحب

لی کنویسنگ کے قافلے کی حیثیت سے ''جادۂ پیما'' ہونے والا ہے ! ۱۹۵۳ء میں کراچی کی متذکرہ بالا تثلیث سے بھرپور تعاون ''شمال'' سے صرف ایک شخص نے کیا تھا یعنی سید مراد علی شاہ صاحب نے' جو اگرچہ زیرِ تعلیم تو لاہور میں تھے لیکن تعلق سرحد سے رکھتے تھے (واضح رہے کہ یہ بھی سینیٹر بننے سے بال بال ہی بچے ہیں !) اور بعد میں جماعت اسلامی سرحد کے ''رہنمائوں'' میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ قاضی حسین احمد صاحب کا ان سے تعلق بالکل اسی نوعیت کا ہے جو کراچی کے سید منور حسن صاحب کا سینیٹر پروفیسر خورشید احمد سے !

اپنی ۱۹۸۲ء کی تحریر میں مَیں نے ۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تحریک اسلامی کا ''عام الحُزن'' قرار دیا تھا۔ یہ بات مجموعی طور پر تو درست تھی ہی' ذاتی طور پر میرے لیے ''درست تر'' تھی۔ مَیں اُس ''اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان'' کو جس کے لیے مَیں نے اپنے کیریئر کو دائو پر لگا دیا تھا اور اپنی زندگی کے پورے پانچ سال نہایت تندہی کے ساتھ صَرف کیے تھے اپنی نگاہوں کے سامنے نظریاتی اور انقلابی راہ سے ہٹ کر خالص سیاسی ذہن رکھنے والے لوگوں کے ''قبضے'' میں جاتا دیکھ رہا تھا اور لاہور میں رہتے ہوئے بحیثیت ناظم اعلیٰ وسائل کی کمی کے باعث دور دراز کی تنظیم یعنی جمعیت کراچی پر اثر انداز ہونے اور نئے رجحانات کو روکنے سے قاصر تھا۔ اور اگرچہ لاہور اور پنجاب میں مَیں نے کراچی کی آئی سی بی کو شکست فاش دے دی تھی لیکن کراچی میں جمعیت کے ''قبضہ گروپ'' کی فنی مہارت سے مات کھا گیا تھا۔ چنانچہ اسی بددلی کے باعث جمعیت کی رکنیت سے فوری طور پر تو مستعفی ہو گیا تھا' تاہم کچھ ہی دنوں بعد میں نے کچھ بعض احباب کے سمجھانے سے' اور اصلاً اپنے اس احساس کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے' اور اس کے لیے جماعت کا التزام شرطِ لازم ہے' استعفاء واپس لے لیا تھا' اگرچہ تعلیمی

سال ۵۴۔ ۱۹۵۳ء کے دوران میں نے کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اور اکثر و بیشتر تو صرف ایک عام کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ البتہ ۱۹۵۴ء کی تعطیلاتِ موسمِ گرما کے دوران ملتان میں منعقدہ ایک تربیت گاہ میں' جو غالباً پندرہ دن جاری رہی تھی' میں نے مولانا امین احسن اصلاحی سے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء کی تربیت گاہوں میں حاصل شدہ قرآن کے دروس اور تزکیۂ نفس کے لیکچرز کو جس طرح ''بیان'' اور صحیح تر الفاظ میں reproduce کیا اس کی ایک لذت کا احساس خود مجھے بھی آج تک ہے اور اس کی ایک شہادت جناب نصراللہ شیخ صاحب نے' جو اُن دنوں جمعیت ملتان کی روحِ رواں تھے' خود مولانا اصلاحی کے سامنے ایک موقع پر ان الفاظ میں دی کہ ''مولانا ! آپ کے اپنے درس بھی ہم نے بہت بار سنے' اور تزکیۂ نفس پر اب آپ کی کتاب بھی طبع ہو گئی ہے' لیکن آپ کی یہ چیزیں جس طور سے اُس تربیت گاہ میں ہمیں ڈاکٹر اسرار نے پڑھائی تھیں اُس جیسی نہ لذت پھر کبھی حاصل ہوئی نہ understanding !

قصّہ مختصر' ۱۹۵۴ء کے دوران مولانا مودودی جیل میں تھے۔ اور میری کیفیت جمعیت کے حالات

کے مشاہدات کی بنا پر بالکل وہی تھی جو اب سے ایک سال قبل نعیم صدیقی صاحب کی نظم ''بنامِ دلبر'' میں سامنے آتی ہے'------ البتہ اس پورے سال کے دوران چونکہ مَیں جمعیت میں زیادہ فعال نہیں رہا' لہٰذا غور و فکر کے لیے وافر وقت ملتا رہا------ اور مَیں کم از کم ذاتی اعتبار سے تو اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ مولانا مودودی نے ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں (اتفاق سے وہ بھی ستمبر ہی کا شمارہ تھا!) پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے جو دو ممکن طریقے بیان کیے تھے' ان میں سے جس طریقے پر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۳ء عمل کیا ہے اس کا غیر مفید ہونا واضح ہو چکا ہے' اور اب دوبارہ اسی دوسرے طریقے پر عمل شروع کر دینا چاہیے جس پر جماعت قیامِ پاکستان سے قبل عمل پیرا تھی' لیکن یہ بس ایک ''رائے'' تھی جس پر کوئی عزم بالجزم مجھے اُس وقت تک حاصل نہیں ہوا تھا اور اپنی جگہ اس کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود میرا ذہن اس کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرنے کے لیے بھی پوری طرح آمادہ تھا!

بہرحال نومبر ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان سے فارغ ہو کر میں منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل ہو گیا' اور ایک ہی تاریخ میں جمعیت طلبہ سے آخری رخصتی استعفاء اور جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست تحریر کر دی۔ اُن دنوں مولانا مودودی ملتان جیل میں نظربند تھے' اور یہ بھی نومبر ۱۹۵۴ء ہی کا واقعہ ہے کہ منٹگمری سے ایک وفدان سے ملاقات کے لیے وہاں گیا تو مَیں بھی اس میں شریک تھا۔ جب ملاقات کا معیّن وقت ختم ہونے کے قریب ہوا تو میں نے چند منٹ کے تخلئے کی اجازت طلب کی' اور باقی حضرات کے رخصت ہو جانے پر تنہائی میں مولانا سے سوال کیا کہ: ''کیا آپ کے خیال میں ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم موجودہ طریق کار کو ترک کرکے دوبارہ قبل از تقسیم ہی کے طریق کو اختیار کر لیں!'' اس پر مولانا کا مختصر جواب تھا: ''مَیں ابھی اِس راستے کے لیے دروازے بند نہیں پا رہا!'' ظاہر ہے کہ اس پر زیادہ بحث و تمحیص کے لیے نہ تو وقت ہی دستیاب تھا' نہ میری حیثیت ہی ایسی تھی کہ مولانا سے لمبی بحث کر سکتا' نہ ہی ابھی خود مَیں اس رائے پر پوری طرح جازم ہوا تھا۔

لیکن ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے دوران جب مَیں نے نہ صرف امیر جماعت اسلامی منٹگمری کی حیثیت سے زور شور کے ساتھ کام کیا' بلکہ حلقہ اوکاڑہ کی مجلس شوریٰ کے رکن' اور ایک عوامی مدرّس قرآن کی حیثیت سے میرا پورے حلقے میں آنا جانا ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جماعت کے کارکنوں اور عہدیداروں کا اخلاقی معیار کم از کم اُس تصویر کے مقابلے میں بہت نیچے گر چکا ہے جو اس کے لٹریچر میں سامنے آتی ہے' اور اس طرح آٹھ نو سال کی سیاسی سرگرمی نے نہ صرف یہ کہ جماعت کی اصولی' انقلابی حیثیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے بلکہ ارکان اور کارکنوں کے اخلاقی معیار کو متأثر کر کے اس کی معنوی قوت اور اخلاقی ساکھ کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ اب مجھے اپنی اس رائے پر زیادہ انشراح حاصل ہو گیا کہ ہمیں فی الفور قبل از قیامِ پاکستان کی پالیسی کی جانب رجوع کر لینا

چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نومبر ۱۹۵۵ء میں جماعت کا جو سالانہ اجتماع کراچی میں منعقد ہوا اس میں مَیں نے جماعت کی پالیسی کے ضمن میں اظہارِ خیال کے لیے نوٹس ارسال کر دیا تھا۔

نومبر ۱۹۵۵ء کے سالانہ اجتماع سے لے کر فروری ۱۹۵۷ء کے اجتماعِ ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ تک کی تلخ داستان مَیں اپنی تالیف ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'' میں تحریر کر چکا ہوں' اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں میری مفصّل رائے بھی' جو مَیں نے ایک بیان کی صورت میں نومبر ۱۹۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کی تھی' ۱۹۶۶ء میں ''تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے طبع ہو گئی تھی' لہٰذا ''میرے مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ ذاتی ربط و تعلق'' کی اِس داستان میں متذکرہ بالا خاکے کی شق نمبر۳ کے ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ۱۹۶۲ء کے حج کے موقع پر جو ملاقاتیں مولانا سے رہیں ان کی قدرے تفصیل بیان کر دی جائے!

مکّہ مکرمہ میں مولانا فندق مصر میں مقیم تھے۔ اور مَیں کئی بار اُن سے ملنے وہاں گیا تو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور اپنی اُس وقت کی ذہنی و قلبی کیفیت کے اعتبار سے کسی قدر افسوس بھی ہوا کہ ہوٹل کے لائونج میں مولانا تو اکثر و بیشتر تنہا بیٹھے ہوتے تھے لیکن مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلہٗ کے گرد ہر وقت ملاقاتیوں کا جمگھٹا رہتا تھا' جن میں اکثریت عربوں کی ہوتی تھی۔ اور اکثر یہ الفاظ سننے میں آتے رہتے تھے: ''اَین الاستاذ الندوی؟'' جس سے اندازہ ہوا کہ اہلِ عرب اُس وقت تک مولانا سے زیادہ واقف نہیں تھے!

اسی سال ''رابطہ عالم اسلامی'' کا تأسیسی اجلاس منعقد ہوا تھا اور پاکستان سے مولانا مودودی اور مولانا دائود غزنوی اسی میں شرکت کے لیے وہاں بلائے گئے تھے۔ مولانا دائود غزنوی کا مجھ پر یہ کرم ہوا کہ انہوں نے مجھے اپنا ''سیکرٹری'' قرار دے دیا اور اس طرح میں بھی اُن مجالس میں باضابطہ شریک رہا۔ اُن دنوں کی چند باتیں جو حافظے میں محفوظ ہو گئیں عمومی دلچسپی کے پیش نظر درج ذیل ہیں:

۱۔ افتتاحی اجلاس میں پہلا خیر مقدمی خطاب مفتیٔ اعظم سعودی عرب ابراہیم بن محمد کا تھا جو ''آلِ شیخ'' یعنی شیخ عبدالوہاب نجدیؒ کی اولاد میں سے تھے' اور نابینا تھے۔ ان کا

خطاب رسمی بھی تھا اور مختصر بھی۔ تاہم اس کے اختتام پر حاضرین نے تالیاں بجائیں تو انہوں نے سختی سے ڈانٹ پلائی کہ یہ بتدعانہ بلکہ فاسقانہ عمل ہے ! (واضح رہے کہ یہ سعودی عرب کے ''خاتم المفتیین'' تھے' اس لیے کہ ان کی وفات کے بعد یہ عہدہ ہی ختم کردیا گیا۔ اور اس طرح آلِ سعود اور آلِ شیخ کے مابین دنیوی حکومت اور مذہبی سربراہی کی جو تقسیم چلی آرہی تھی وہ ختم ہو گئی۔)

۲۔ اس اجلاس کے باضابطہ ''کنوینر'' تو مولانا علی میاں مدّظلہٗ تھے' لیکن عملاً اسے conduct ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کر رہے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ استاذ سعید رمضان یہاں کس حیثیت میں ہیں؟ تو ڈاکٹر صاحب کا رنگ تو زرد پڑگیا لیکن مولانا علی میاں نے یہ کہہ کر صورتِ حال کو خراب ہونے سے بچا لیا کہ ''یہ ذمہ داری مَیں نے ان کے سپرد کی ہے !'' (واضح رہے کہ ''رابطۂ عالم اسلامی'' کی بنیاد اصلاً مصر کے صدر ناصر کے ''بُغض'' پر رکھی گئی تھی' اور اعتراض کرنے والے غالباً مصری مندوب تھے !)

۳۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے مندوبین اپنے ذاتی تعارف کے ساتھ ساتھ کچھ جذبات و احساسات کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ اِس ضمن میں شام کے مندوب کا یہ جملہ بہت دلچسپ تھا کہ: ''جب مجھے دعوت نامہ ملا تو میں اس شش وپنج میں مبتلا ہو گیا کہ آئوں یا نہ آئوں۔ اس لیے کہ اس قسم کے اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں اور ان سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جانا نہ جانا برابر ہے۔ لہٰذا مَیں حاضر ہو گیا !'' (اُن کا اشارہ اِس طرف تھا کہ کسی اور خیر کی توقع تو اس اجلاس سے نہیں ہے' تاہم مفت کا سرکاری حج جو اس اجلاس کے ''بونس'' کے طور مل گیا غنیمت ہے۔ گویا ''گندم اگر بہم نہ شود بھُس غنیمت است !''

۴۔ اس موقع پر ایک اجتماع ''قصر الملک'' میں بھی ہوا جس سے اُس وقت کے بادشاہ اور سعودی مملکت کے بانی ملک عبدالعزیز ابن سعود کے فرزندِ اکبر سعود بن عبدالعزیز نے خطاب کیا' جس میں انہوں نے صدر ناصر کا نام لیے بغیر اہلِ مصر کو خوب کوسا۔ ان کے

خطاب کا یہ ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے ''ھُم اَعداءُ اللّٰہِ وَاَعْدَاءُ الرَّسُولِ وَاَعداءُ الدِّین ونحن فِداءُ الاِسلام بِاَرواحِنا واَجسَادِنا!'' یعنی وہ تو اللہ' رسول ﷺ اور دین کے دشمن ہیں جبکہ ہم دل و جان سے اسلام کے فدائی ہیں ! ----- - نفس مضمون سے قطع نظر ان کا یہ خطاب بڑا فصیح و بلیغ' شاہی دبدبہ و جلال کا مظہر' اور عربی مقولے ''کلام المُلوکِ مُلوکُ الکلام'' کا بہترین نمونہ تھا ! ------ خطاب کے اختتام پر بادشاہ سلامت کھڑے ہوگئے اور جملہ مندوبین ایک قطار کی صورت میں حرکت کرتے ہوئے اُن کے سامنے آکر ان سے ہاتھ ملاتے رہے۔ اتفاقاً مولانا دائود

غزنوی اور مَیں ذرا آگے تھے لہٰذا ہمیں تو ملک سعود سے مصافحہ کا ''شرف'' حاصل ہو گیا۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ مولانا مودودی اور جناب خلیل حامدی ابھی کسی قدر فاصلے ہی پر تھے کہ بادشاہ سلامت غالباً تھک گئے۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ بلند کر دیا ------ جس سے یہ سلسلہ فوراً بند ہو گیا۔

مولانا سے میری ایک انتہائی یادگار ملاقات ۸ ذی الحجہ کی شام کو منیٰ میں ہوئی۔ مولانا سرکاری مہمان ہونے کے ناتے ایک کشادہ اور عمدہ خیمے میں مقیم تھے جس کے ساتھ کچھ کھلی جگہ بھی تھی اور پھر قناتوں کا گھیرا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ مولانا خیمے کے باہر ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ اور ظاہر ہے کہ احرام میں تھے! (چنانچہ مولانا کی وہ احرام والی تصویر میرے نہاں خانۂ ذہن میں تاحال محفوظ ہے۔) بہرحال اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا اُس وقت سخت صدمے بلکہ پیچ و تاب کی سی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس کیفیت کے دو اسباب اُسی وقت معلوم ہو گئے تھے: ایک یہ کہ پاکستان سے اسی روز اطلاع آئی تھی کہ جو بلدیاتی یا بنیادی جمہوریت کا انتخاب ہوا تھا اس میں جماعت بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔ اور دوسرا یہ کہ مولانا نے مدینہ یونیورسٹی کے لیے جو خاکہ بڑی محنت سے تیار کیا تھا اُسے نجدی علماء کی شدید مخالفت کے باعث کلیۃً رد کر دیا گیا تھا۔ پہلی بات کے ضمن میں میرے دل میں یہ فوری خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہی ملتان جیل والا سوال آٹھ سال بعد پھر دوبارہ مولانا سے کروں' لیکن مولانا کی اُس وقت کی کیفیت مجھے اس کے لیے موزوں محسوس نہ ہوئی!

البتہ مدینہ منورہ میں مولانا کی خدمت میں متعدد بار کی حاضری کے بعد ایک دن مجھ سے رہا نہیں گیا اور مَیں نے براہ راست سوال کر ہی لیا کہ: ''مولانا! کیا اب بھی آپ اس بات کے قائل نہیں ہوئے کہ ہماری بعداز تقسیم کی پالیسی غلط تھی!'' لیکن اس بار اس کا جو جواب مجھے ملا اس میں کسی قدر تلخی اور درشتی کا عنصر بھی شامل تھا ------ یعنی: ''یہی سوال میں آپ لوگوں سے کرتا ہوں کہ کیا اب بھی آپ لوگوں پر اپنی غلطی واضح نہیں ہوئی!'' ------ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ میرے دل میں امید کی جو کرن اُس وقت تک روشن رہی تھی کہ جیسے جیسے اس طریق کار کے نتائج سامنے آئیں گے 'ان شاء اللہ' مولانا خود اپنی رائے سے رجوع کر کے انتخابی سیاست سے واپسی کا راستہ اختیار کر لیں گے وہ اُس روز بالکل بجھ کر رہ گئی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصے کے بارے میں جو چند سطریں میری ۱۹۸۲ء والی تحریر میں شق نمبر۴ کے ذیل میں درج ہیں ان پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صاف اعتراف ہے کہ اس عرصے کے دوران میرے اور مولانا کے مابین بُعد و فصل' اور مغائرت و اجنبیت ہی نہیں نفرت اور کدورت کے پردے بھی حائل رہے اور اس کیفیت میں میری ذاتی تلخی کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کی ''سرپرستی'' کا عنصر بھی شامل رہا جس نے اس میں اضافی شدّت پیدا کر دی!

یہ کیفیت فروری ۱۹۷۱ء میں جس طرح دفعتاً اور یکسر تبدیل ہوئی اس کا ذکر بھی متذکرہ بالا تحریر میں شق نمبر۵ کے ذیل میں اجمالاً لیکن اس سے قبل تفصیلاً موجود ہے۔ میرا یہ ردِّ عمل تو مولانا کی اس تقریر پر تھا جو مولانا نے دسمبر ۱۹۷۰ء میں اچھرہ کے ایک اجتماع میں الیکشن میں جماعت اسلامی کی ذلت آمیز شکست پر ہونے والے تبصروں کے جواب میں جماعت کے مخصوص مزاج اور بالخصوص اس کے تنظیمی ڈھانچے کے ''دفاع'' میں کی تھی۔ افسوس کہ یہ حقائق میرے علم میں بہت بعد میں آئے کہ اس موقع پر مولانا اس حتمی نتیجے تک بھی پہنچ گئے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے الیکشن کا طریقہ بالکل ناکام ہو چکا ہے اور ہمیں اپنے سابق طریق کار ہی کی طرف رجوع کر لینا چاہیے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ جماعت اسلامی کی اُس وقت کی قیادت کی صف دوم نے مولانا

کی اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس پر مولانا کو صدمہ اور افسوس تو بہت ہوا بلکہ مولانا وصی مظہر ندوی کی روایت کے مطابق غصّہ بھی آیا ‘لیکن جماعت کی امارت اور اپنی ضعیف العمری اور خرابیٔ صحت کے پیش نظر یہ سکت اب مولانا میں نہیں رہی تھی کہ دوبارہ خود سٹیئرنگ سنبھال کر تحریک کی گاڑی کی ''سواقی'' کے فرائض سر انجام دیتے ! بہرحال مَاشاء اللہ کان و مالم یشأ لم یکن !''

اس دوران میں ''دل را بہ دل رہیست !'' کے مصداق ظاہر ہے کہ جس تلخی کا مظاہرہ میری جانب سے آٹھ سال تک مسلسل ہوتا رہا تھا اس کا ردِّ عمل مولانا کی طبیعت میں لازماً پیدا ہوا ہو گا۔ اگرچہ میرے علم میں نہیں ہے کہ مولانا نے کبھی کوئی تلخ بات میرے بارے میں کہی ہو‘------ لیکن جب خود میری قلبی کیفیت بدل گئی تو اس کا یہ ردِّ عمل میرے علم میں ۱۹۷۶ء میں آیا کہ جب میں اواخر ماہ دسمبر میں مع اہلِ خانہ لگ بھگ دس روز کراچی میں مقیم رہا اور انہی ایام میں ایک روز جناب عبدالرحیم صاحب نے جو اُس زمانے میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ڈپٹی چیف مکینیکل انجینئر کے عہدے پر فائز تھے ہمیں ایک فیملی پکنک کے سلسلے میں سمندر کی سیر کرائی تو اس موقع پر انہوں نے بتایا کہ ''انہی دنوں ایک ضیافتِ طعام میں جہاں مولانا مودودی بھی موجود تھے‘ اور میں بھی‘ آپ کا (یعنی راقم الحروف کا) ذکر آنے پر مولانا نے یہ فرمایا کہ: مجھے اس کے بارے میں اس بات کا پورا اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی ہو گا دین کا کام کرتا رہے گا !'' اس پر ایک بار تو مولانا سے ملاقات کی خواہش کی چنگاری بہت زور سے بھڑکی‘ لیکن بعد میں ان اسباب کے باعث جن کا ذکر ۱۹۸۸ء کی تحریر میں موجود ہے‘ زندہ مودودی سے تو ملاقات کی نوبت نہ آسکی‘ یہ بھی اللہ کا خصوصی فضل و احسان ہی تھا کہ ان کے جَسَدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت ہی نہیں اس کی امامت کی سعادت بھی حاصل ہو گئی ! جس کی تفصیلات میری ۱۹۸۲ء کی تحریر میں موجود ہیں !

بہرحال جماعت اسلامی کے داعی‘ مؤسس اور ’’فطری امیر‘‘ مولانا مودودی کو تو ’’تِلکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ‘‘ کے زمرے میں شامل ہوئے تیرہ برس بیت چکے ہیں۔ اور جس

طرح دارالعلوم دیوبند اپنا ’’جشن صد سالہ‘‘ دھوم دھام کے ساتھ منانے کے فوراً بعد شکست و ریخت سے دوچار ہو گیا تھا‘ اسی طرح جماعت اسلامی بھی گزشتہ سال اپنا ’’پچاس سالہ جشن‘‘ شان و شوکت کے ساتھ منانے کے بعد داخلی انتشار اور خلفشار کے شدید بحران سے دوچار ہو چکی ہے اور اس فیصلہ کُن دوراہے پر آکھڑی ہوئی ہے کہ ... یا اپنی اِس اصل غلطی کا ادراک اور اعتراف کرے جو ۴۸۔ ۱۹۴۷ء میں پوری نیک نیتی کے ساتھ لیکن ’’عجلت پسندی‘‘ کے باعث ہو گئی تھی‘ اور اپنے اصل ’’اصولی‘‘ اور ’’انقلابی‘‘ طریق کار کی جانب مراجعت اختیار کرے یا میاں طفیل محمد اور جناب نعیم صدیقی ایسے ’’اگلے وقتوں‘‘ کے لوگوں کے احتجاج اور نالہ و فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بچی کھچی اصول پسندی‘ سنجیدگی‘ متانت‘ شرافت اور قانون و دستور کی پابندی کے ’’دقیانوسی‘‘ لبادے کو بالکل اتار پھینکے اور انتخابی سیاست کا راستہ ہی اختیار کرنا ہے تو جملہ ’’سِکّہ ہائے رائج الوقت‘‘ کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ؎ ’’نصف بہتر حیات کر گزر جو آئے بن!‘‘ کا راستہ اختیار کر لے۔

اس ضمن میں ملک بھر کے صحافی اور تجزیہ نگار تو یہی کہہ رہے ہیں کہ پلڑا دوسرا ہی بھاری ہے اور نتیجہ مؤخر الذکر ہی برآمد ہو گا ... لیکن اگر واقعتاً ایسا ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جماعت اسلامی کی ’’پہلوٹھی کی بیٹی‘‘ (یعنی اس کی اولین ذیلی تنظیم) اسلامی جمعیت طلبہ کے ’’قبضہ گروپ‘‘ نے جو جدید قیادت جماعت کو مہیا کی تھی وہ اپنی کوکھ سے ایک بالکل مختلف ہی نہیں متضاد مزاج اور طرز کی تنظیم یعنی ’’پاسبان‘‘ کو جنم دے کر اپنی ’’مادر تنظیم‘‘ یعنی ’’جماعت اسلامی‘‘ کے اس تنظیمی ڈھانچے کا گلا گھونٹ دے گی جس کا ’’دفاع‘‘ جماعت کے داعی و بانی‘ اور قائد و امیر مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۷۰ء تک تو پورے عزم بالجزم کے ساتھ کیا تھا... اس کے بعد یہ ’’پاسبان تنظیم‘‘ کیا رخ اختیار کرے اور ملک و ملت کو کیا نفع یا نقصان پہنچائے‘ اور خود کس انجام سے دوچار ہو یہ علیحدہ معاملہ ہے... اس لیے کہ حالات کے تیور یہی بتا رہے ہیں کہ جماعت کی موجودہ نوجوان قیادت بھی انتخابی سیاست کے نتائج سے تو مایوس اور بددل ہو چکی ہے‘ لہٰذا یہ نوزائیدہ تنظیم لامحالہ

کسی ’’تصادم‘‘ کی راہ اختیار کرے گی۔ اور غیر تربیت یافتہ نوجوانوں کے اس راہ پر پڑنے سے خیر اور صلاح کی امید کم اور شر اور فساد کا اندیشہ زیادہ ہے۔ واللہ اعلم!

لیکن اصل فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اُسی کی قدرت و قوت فیصلہ کُن ہے‘ لہٰذا کیا عجب کہ ’’لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا‘‘ اور ’’لَعَلَّھُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ‘‘ کی قرآنی نصوص کے مطابق اس اصل تحریک اسلامی کے بچے کھچے

باقیات الصالحات'' جو ۴۱-۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی تھی اسے اس آخری اور فیصلہ کُن تباہی سے بچانے کے لیے کمر کس لیں اور ع ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا !'' کے مصداق ان کی مساعی بارآور ہو ہی جائیں۔

لیکن اس سلسلے میں اصل ذمہ داری پرانے اور بزرگ حضرات کی ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں کہ آج وہ جن چیزوں سے سخت توحش اور بیزاری محسوس کر رہے ہیں وہ اس بنیادی غلطی کے لازمی اور منطقی نتائج اور عواقب کی حیثیت رکھتی ہیں جو ۴۸-۱۹۴۷ء میں سرزد ہوئی تھی اور اس کے برملا اعتراف کے بغیر صورت حال میں کسی بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور یہ وہ ''سجدۂ سہو'' ہے جو ؎

''یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات !''

کے مصداق اس تحریک کو ان تمام خرابیوں کی دلدل سے نکال سکتا ہے جس میں احیائِ اسلام اور اقامت دِین کی یہ عظیم تحریک پھنس گئی ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا البَلاغ !

* * *